

# جلد ۱ . فرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	تہذیب	۳
۲	خدا کی معرفت میں دشواری اور اُس کے اسباب	۵
۳	پہلا سبب	۶
۴	دوسرا سبب	۸
۵	تیسرا سبب	۹
۶	چوتھا سبب	۱۱
۷	پانچواں سبب	۱۹
۸	چھٹا سبب	۲۶
۹	ساتواں سبب	۲۸
۱۰	آٹھواں سبب	۲۹
۱۱	نواں سبب	۳۰
۱۲	ان مشکلات کا حل	۳۲
۱۳	معرفت خدا کی ضرورت	۵۲
۱۴	معرفت خدا کا عملی نتیجہ	۷۱
۱۵	خدا کا وجود	۸۲
۱۶	امادی اور غیر امادی اشیاء کا تفرقہ	۸۷
۱۷	موجد کی تلاش	۹۵
۱۸	تکامل کا ماد	۹۸



صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۹۹	صناعی کی مثالیں	۱۹
۱۱۰	کائنات پر مجموعی نگاہ	۲۰
۱۱۱	ہستی کے لئے مرکز کی ضرورت	۲۱
۱۱۳	نقائص کی سرحدوں سے لامحدود کمال کا سراغ	۲۲
۱۱۶	ذبیات مخلوق سے ذبیات خالق کا پتہ	۲۳
۱۱۷	معرفت خدا کے طریقے	۲۴
۱۲۵	خدا کے وجود پر ائمہ معصومین کے بیانات	۲۵
۱۳۰	شکرین خدا کا سرمایہ	۲۶
۱۳۱	مادین کا مذہب اور اس پر تبصرہ	۲۷
۱۵۰	حیات اجسام کا سرغامض	۲۸
۱۶۳	خدا کے صفات	۲۹
۱۶۴	نفی جسمیت	۳۰
۱۶۵	ابطال رویت	۳۱
۱۷۱	صفات سلیمیہ کی اہمیت	۳۲
۱۷۲	صفات زائدہ کا ابطال	۳۳
۱۸۶	توحید اسلامی	۳۵
۱۸۸	خدا پرستی اور مادیت کی جنگ	۳۶
۲۰۲	معرفت خدا عملی نتیجہ	۳۷



لَقُوف

۲۹۷

ع ل ی

۱۹

چشم

ازافادات

حضرت سید العلماء مولانا سید تقی المتقونی دام ظلہ

مطبوعہ سرفراز قومی پریس و کثورہ اشرف لکھنؤ

SALAR JUNG EST. LIBRARY

(Oriental Section)

UPPU PRINTED BOOKS:

No. 1117



# امامیہ سن لکھنؤ کی تیسرے سٹھویں سالانہ ذہنی خدمت



مدت الوداعین لکھنؤ میں جناب سید العلماء مدظلہ کے مسلسل دس  
روز تک جو بیانات ہر سال ہوتے ہیں۔ اس سال ۱۳۵۷ھ میں بھی محرم  
کی آخری تاریخوں میں ہوئے۔

اب کی ان بیانات کا انتہائی اہم موضوع اقل الدین معرفتہ  
کے عنوان سے معین ہوا تھا  
ہمارے کرمفرما جناب سید محمد رضا صاحب نقوی سابق سکریٹری امامیہ  
نے ان مواقع کو شارت ہینڈ سے بڑی جانفشانی کے ساتھ قلب بند فرمایا  
اور اب وہ کتابی صورت سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

امید ہے کہ افراد قوم اس مجموعہ کی صحیح اہمیت کا احساس فرمائیں گے اور  
ہماری اس خدمت کی عملی ہمت افزائی فرمائیں گے۔ والسلام

خادم ملت

سید ابن حسین نقوی سکریٹری

ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ

امامیہ سن لکھنؤ





بِسْمِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

۱۱۱۳

لِلْحَمْدِ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةِ عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ  
وَعَلَى الْمُصْطَفَى خَاتَمِ النَّبِيِّينَ وَآلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ الْمُصَوِّمِينَ مِنْ  
يَوْمِنَا هَذَا إِلَى يَوْمِ الدِّينِ.

تمہید

## اَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَةُ

یہ اس سرائے بیان ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ دین کی پہلی منزل اس کی  
معرفت ہے۔ وہ کون؟ یعنی خدا۔ خدا سے کیا مراد ہے۔ اس کی تفسیر  
وہی کرنا چاہئے جو معرفت حاصل ہونے کے قبل کی منزل قرار پاسکتی  
ہے۔ کیونکہ معرفت تو وہ حکم ہے جو اس موضوع پر مرتب کیا جا رہا ہے  
ہیں کہنا یہی ہے کہ خدا کی معرفت حاصل کرو۔ اس لئے خدا کا کوئی ایسا  
مفہوم بتانا چاہئے جو معرفت حاصل کرنے کے پہلے مخاطب کے سطحی ذہن میں  
آسکے۔ اس کے تفصیلی ذات و صفات کا علم حاصل ہو جائے تو وہ



معرفت کی اصل منزل ہے۔ جس تک پہنچنے کی ہم تحریک کر رہے ہیں اس لئے وہ اس حکم کے موضوع میں داخل نہیں ہو سکتی۔

یہاں تو خدا کے مفہوم کی ایسی توضیح ہونا چاہئے جو نشان مقصد کی حقیقت سے ضروری ہے۔

یہ خدا کیا ہے جس کی معرفت حاصل کرنے کی طرف دعوت دہی جارہی ہے؟ ممکن ہے کہا جائے کہ "خدا" سے مراد وہ شے ہے جو کائنات کی مبداء اول ہے۔ اس طرح دائرہ میں اس کے تھوڑی تحدید ضرور پیدا ہوتی ہے مگر پھر بھی خدا کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ اس لئے کہ مادیتیں و طبیعیین عالم کے لئے ایک مبداء قرار دیتے ہیں اور وہ وہی ذرات مادہ ہیں یا طبیعت۔ مگر پھر بھی وہ خدا کے قائل نہیں مانے جاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کا مفہوم کچھ اس کے علاوہ ہے۔ صرف مبداء عالم کا اقرار کر لینا خدا کے وجود کا اقرار نہیں ہے۔ اس میں کچھ قید لگانے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام کائنات کے لئے ایک ذی شعور خالق، اس کا ماننا خدا کا ماننا ہے یہی وہ چیز ہے جس کے تلام ارباب مذاہب قائل ہیں اور مادیتیں و ہرین و طبیعیین جس کے منکر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اہل مذاہب میں اس کے صفات میں اختلاف ہے۔ یہی صفات کا حقیقی علم کا



کرنا اُس کی معرفت ہے۔ لیکن معرفت حاصل کرنے کے لئے ذہن کو متوجہ کرنے کے لئے اتنا ہی سمجھنا ضروری ہے۔ "کائنات کا ذی شعور خالق" اسی کو خدا کہتے ہیں اس کا جو مصداق ہے اُس کے ہر زبان میں مخلوق نام ہو گئے ہیں۔ جیسے عربی میں اللہ۔ فارسی سنسکرت اور انگریزی ہر زبان میں اسی طرح وہ نام جو اس سے مخصوص ہو۔

## خدا کی معرفت میں دشواری اور اُس کے اسباب

وہ خدا جو کائنات کا ذی شعور خالق ہے جس کا نام ہے "اللہ" اور جس کے ہر زبان میں نام موجود ہیں اُس کے حقیقی اوصاف کیا ہیں؟ یہ معرفت کی منزل ہے۔ مگر یہ منزل انتہائی دشوار ہے۔ آپ تمام مذاہب عالم کو ایک جانب اور مادیات وغیرہ کی جماعت کو ایک جانب قرار دیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ اکثریت خدا کو ماننے والوں ہی کی ہے۔ یعنی مذاہب کی تفریق سے قطع نظر کر کے۔ اسلام ہو یا عیسائیت۔ جوسیت ہو یا یہودیت یا ہندو دھرم ان تمام کے باہمی اختلافات کے علاوہ ہو کر اُس نقطہ مشترک کے اعتبار سے جس پر یہ سب مجتمع ہیں یعنی ایک ایسی ہستی کو مانتا جو اس تمام کائنات کی خالق ہو، ملاحظہ فرمائیے تو یقیناً اُس کے ماننے والوں کی تعداد



بہ نسبت نہ مانتے والوں کے بہت زیادہ ہے۔ لیکن ان سب ماننے والوں کو دیکھا جاتا ہے کہ یہ اوصاف الٰہی کی تعین میں کسی ایک نقطہ پر مجتمع نہیں ہوتے بلکہ جو فرق ہے وہ ایک خاص خیال رکھتا ہے۔ حالانکہ جو ماننے والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اُس کا وجود انتہائی نمایاں ہے۔ ہر شخص کی زبان پر یہ آیا کرتا ہے کہ عالم کا ہر ہر پتہ اُس کے وجود پر گواہ ہے اور دنیا کے کائنات کا ہر ذرہ اُس کا پتہ دیتا ہے لیکن پھر بھی اُس کے پہچاننے میں عالم انسانیت میں اس قدر افترا ہوا ہے کہ دنیا کا کوئی مسئلہ اتنا محل اختلاف نہیں قرار پایا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ خدا کی معرفت اتنی مشکل کیوں ہے؟ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسان جس چیز کو سمجھنا چاہتا ہے پہلا سبب اُس کا نمونہ اپنے سامنے رکھ لیتا ہے۔ یعنی اگر آپ کسی چیز کو مجھ سے پوچھیں۔ کوئی بھول، کوئی کپڑا، کوئی خاص کتاب اور کوئی چیز جو آپ نے نہ دیکھی ہو اُس کو سمجھنا چاہیں تو میں آپ کے سامنے اُس کا نمونہ پیش کر دوں گا اور مثال دوں گا، آپ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ فلاں بھول کیسا ہوتا ہے؟ میں کوں گا جیسا وہ بھول۔ اُسی سے ملتا جلتا۔ اسی طرح ہر چیز کے لئے کوئی نمونہ ہے۔ اگر کمال نمونہ



نہ ملے گا تو اُس کے مختلف صفات کے لئے مختلف نمونے تلاش کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیں گے۔ مثلاً میں کہوں گا کہ رنگ فلاں چیز کا ہوتا ہے، بون فلاں کی، ذائقہ فلاں چیز کا، شکل فلاں چیز کی۔ اس طرح اگرچہ چیز پورے طور پر آپ کے سامنے نہ آئی مگر مثالوں نے ایک صورت اُس کی آپ کے ذہن میں ضرور پیدا کر دی۔

لیکن اگر کوئی ہستی ایسی ہو کہ اُس کی مثال بالکل نظر سے گزری ہی نہ ہو۔ اُس کا ہر پہلو بے مثال ہو تو اُسے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کس طرح کی جائے۔

انسان جتنا غور کرتا ہے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جیسا ہڈی سا کچھ بھی نہیں ہے۔ اب میں اگر اُس کو سمجھانے کی مثالوں کے ذریعہ سی کوشش کروں تو جتنی مثالیں بڑھتی جائیں گی اتنا ہی اُس کی منزل سے دور ہوتا جاؤں گا۔ اس لئے کہ وہ کمال مطلق ہے اور ادھر ہی نقص۔ وہ غنی مطلق ہے اور ادھر ہی احتیاج۔ وہ واجب الوجود ہے اور ادھر ہے امکان۔ بالکل یہ چیزیں اُس سے الگ ہیں۔ اگر میں ان ناقص چیزوں کو ملاؤں گا تو نقصان کی تصویر مکتل ہوگی اور کمال اتنا ہی دور ہو جائیگا۔ یہ مثالوں کا دینا اُس کی ذات سے اور بیگانہ بنائے گا نہ یکہ اُس کی شناسائی کا باعث ہو پھر آسانی سے اُس کی معرفت



کماں حاصل ہو سکتی ہے۔

انسان کی طبیعت کو جس بات سے لگاؤ ہوتا ہے  
**دوسرا سبب** اُس بات سے طبعی حیثیت سے مانوس ہوتا ہے

اپنے شہر کے لوگ، اپنے محلہ کے رہنے والے، اپنے گھر کے افراد اُن سے  
 درجہ بدرجہ انس کیوں ہوتا ہے اس لئے کہ اُس کے ماحول سے انہیں  
 اتنا ہی زیادہ تعلق ہے اور اجنبی اشخاص، دوسرے ملک کے رہنے والوں  
 سے آدمی کیوں گھبراتا ہے اس لئے کہ اُس کو اُن کے ساتھ مچانست  
 نہیں ہے اور سابقہ نہیں رہا ہے۔ جو کام آپ ایک دفعہ کر چکے ہیں اُس کے  
 لئے آپ سے کہا جائے تو آپ کو کوئی دشواری نہ محسوس ہوگی۔ اسی  
 طرح اگر خود نہیں کیا ہے مگر دیکھا ہے ایسے لوگوں کو جنہوں نے اُس مہم  
 کو سر لیا ہے اس جگہ قدم کچھ رکے گا بھی تو پھر دوسرے لوگوں کا مشاہدہ  
 بڑھادیکا اس لئے کہ طبیعت اُس سے کسی حد تک مانوس ہو چکی ہے۔  
 ایک مکان جہاں آپ برابر آتے جاتے رہے ہوں وہاں کچھ دیر تنہا  
 بھی بیٹھنا پڑے تو وحشت نہیں ہوگی۔ مگر ایسے مکان میں جو بالکل  
 اجنبی ہو تھوڑی دیر رہنے میں دل پریشان ہوگا۔

اب آپ دیکھئے کہ انسان خود مادی ہے۔ آنکھیں کھولتا ہے تو  
 ہر طرف دکھائی دیتا ہے مادہ۔ آنکھیں بند کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے



مادہ بنتا ہی تو مادی فضائل کی آوازیں کانوں میں آتی ہیں۔ قوتِ شناسی سے کام لیتا ہی تو اسی مادی دنیا کی خوشبواور بدبو کا احساس کرتا ہے چھوتا ہی تو مادی اجسام ہاتھ سے متصل ہوتے ہیں، غرض سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے آنکھوں میں۔ کانوں میں۔ دماغ میں۔ دل میں ہر طرف یہ مادہ ہی مادہ ہے

مگر وہ ہستی جسے "خدا" کہا جاتا ہے وہ ہے جسے کبھی اُس نے خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ کیونکہ خواب میں وہی چیز دکائی دیتی ہے جو بیداری میں دیکھنے کے قابل ہو۔ پھر اس عالم ممکنات کے ماحول سے دور ہو کر ان موجودات کی چار دیواری سے نکل کر۔ اس مادی حصار کی دیواری کو پہچان کر اُس حقیقت کے ادراک پر یہ اپنی طبیعت کو کیونکر متوجہ کرے؟ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ماننے میں عذر ہوتا ہے۔ اگر مان بھی لیتا ہے تو اُس کے اوصاف ویسے ہی قرار دینے لگتا ہے جو مادی چیزوں میں اُس کی آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں۔

**سبب** دنیا میں انسان ہر چیز کو اُس کی نفی سے سمجھتا ہے۔ آپ **میسرا**۔ نو کو کس طرح سمجھے؟ ظلمت سے! میں سچ کہتا ہوں ذرا اپنی طبیعت کو ان ظاہری احساسات سے الگ کر کے تھوڑی دیر کے لئے یہ ماننے کی رات نہیں ہوتی ہمیشہ دن رہتا ہے تو آپ



شکل سے اس کو مانیں گے کہ روشنی بھی کوئی چیز ہے۔  
 آپ جب آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ یہ دیوار دکھائی دیتی ہے۔  
 وہ درخت دکھائی دیتا ہے۔ آسمان زمیں، جانور، آدمی غرض یہ  
 اجسام ہیں جن کے رنگ اور شکل کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ  
 نور کوئی چیز نہیں ہے جو دکھلائی دے۔ انسان کو یہ سمجھئے کہ کافی موقع  
 حاصل ہے کہ جو کچھ ہے وہ یہی اجسام اور اُن کے اوان اشکال  
 بس اس کے علاوہ نور کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن جب رات آتی ہے  
 اور یہ وہ ڈالتی ہے اور اُس وقت چیزیں سب رہتی ہیں۔ اُن کے  
 لون و شکل بھی قائم رہتے ہیں مگر وہ دکھلائی نہ دیتیں۔ اس وقت  
 سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی چیز اور بھی تھی جس کا نام تھا "نور" وہ  
 سب اُس کا فیض تھا اور اُس کے نہ ہونے سے اب یہ عالم ہے۔  
 یعنی عالم کائنات میں احساس نور نام ہے احساس اشیاء کا۔ اُس  
 نور کا احساس آپ کو اس وقت بھی نہیں ہے۔ اشیاء کا احساس  
 ہونے لگا اور سمجھے کہ نور یہی ہے۔ لیکن سمجھے یہ اُسی وقت جب ایک  
 وقت میں نور نہ رہا اور احساس اشیاء غائب ہو گیا۔ پھر اگر نور وہ  
 ہو جو کبھی غائب نہ ہو تو اُس کی قدر کس طرح ہو؟  
 میرا مطلب یہ ہے کہ اگر عالم اور اک و اطلاع انسانی میں



عالم مشاہدہ و ملاحظہ میں کوئی ایسا وقت اور ایسا دور آیا ہوتا کہ جب خدا نہ ہو تو خدا کا ماننا بہت آسان ہو جاتا اور سمجھ میں آ جاتا کہ خدا وہ ہے جس کے ہونے سے یہ فائدہ ہے اور نہ ہونے سے یہ نقصان۔ مگر وہ تو نور حقیقت ہے جو کبھی غروب کرنے والا نہیں ہے اس لئے انسان جلدی سے یہ کہنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ یہی کائنات عالم ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

ہر چیز کے مابعد کا پتہ اُس وقت چلیگا جب ماقبل چوتھا سبب کی انتہا ہو جائے۔ اور جب ابتدا کی منزل پہلے

ہی اتنی وسیع ہو کہ اُس کی حد آخر تک انسان نہ پہنچ سکے تو بعد کی سرحد کا سراغ کیسے ملے گا۔ اگر عالم امکان کو انسان سمجھ لیتا تو وجوب کی حد کو سمجھنا آسان ہوتا لیکن اگر امکان کے حدود اتنی وسیع ہوں کہ لیک کوتاہ نظر انسان کی وسعت جو حد اُن کے سامنے انتہائی مختصر ثابت ہو تو پھر وجوب کی منزل کا پتہ کیونکر لگے۔ ایک انسان جو کہ ہندوستان میں پیدا ہوا ہو اور ہندوستان

کی وسیع فضا کے اندر جس جگہ پونچتا ہے اور پونچتا ہے یہ کون جگہ ہے ؟ معلوم ہوتا ہے ہندوستان ہی اور فرض کیجئے کہ اُس کے ذرائع بھی انتہائی محدود ہیں کہ کسی دوسری جگہ سے کوئی خبر بھی



اُس کو نہیں پہونچتی تو وہ یہ طے کر چکا کہ دنیا بس جو کچھ ہے وہ ہندوستان میں محدود ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ سابق زمانہ میں دنیا ربیع مسکوں میں منحصر سمجھی جاتی تھی۔ بڑے سے بڑا ذی علم اور فلسفی انسان بھی تسلیم دنیا کو زمین کے اس چوتھائی حصہ میں محدود سمجھتا تھا اس لئے کہ امریکہ کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔

یہ کیا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان تنگ نظر واقع ہوا ہے۔ حالانکہ ہماری اطلاع محدود ہے اور واقع ہے لا محدود مگر ہم ہمیشہ واقع کو اپنی اطلاع کے دائرہ میں محدود کر دیتے ہیں۔ یہ تنگ نظری کوئی پرانے زمانہ کے قدیم آدمیوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس زمانہ کے بڑے سے بڑے تعلیم یافتہ لوگ اس تنگ نظری میں مبتلا ہیں اس لئے کہ ہمیشہ وہ واقعیت کو اپنے انکشاف کا پابند سمجھتے ہیں۔ تو اب عالم امکان میں اگر انسان کے حدود اطلاع نقطہ آخرین تک پہونچ جاتے تو آسان تھا کہ انسان حدود میں قدم رکھے۔ یعنی مافوق الطبیعیات وہ اتنا بلند مرکز ہے کہ انسان اگر طبیعیات کی منزل کو ختم کر لیتا تو پھر اس کا ذوق تحقیق آگے جانے پر آمادہ کر سکتا تھا۔ لیکن خود



طبیعیات کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ انسان جتنی تحقیق کرتا ہے وہ بھی منزل آخر تک نہیں پہنچتا ہے تو اب ایک مرتبہ وہ اس تمام عالم کو اپنے نقطہ نظر کو بند کر کے اُس وسیع عالم میں کیسے داخل ہو جائے جو اُس کے مدارِ اک سے ملے اور بالاتر ہے۔

اس سے ایک خاص بات پر پتا ہوتی ہے۔ غور سے ملاحظہ ہو۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب اسرارِ کائنات کی تہ تک پہنچنے کی انسان کو جستجو نہیں پیدا ہوتی تھی۔ یعنی یہ دنیا ایک رازِ سرستہ کی حیثیت سے تھی تو اُس وقت خدا کو پہچانتا بھر بھی آسان تھا۔ لیکن جب انسان جستجو میں مصروف ہوا اب خدا کی معرفت کی منزل امد بھی دور ہو گئی۔

پکيا ہوا ہوا یہ کہ اُس وقت تک تو انسان اس تمام دنیا کو ایک لپٹی ہوئی سوہر صورت سے دیکھتا تھا اور پھر اُس کے خالق کا پتہ چلاتا تھا۔ اُس نے تمام دنیا کو ایک چیز قرار دیا اور کہہ دیا کہ اُس کا کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہے۔ اس طرح پہچانتا آسان تھا مگر جب انسان دنیا کے اسرار کی چھان بین میں پڑا۔ یعنی سائنس اور فلسفہ کی بنیاد پڑی اور اسرارِ ہستی پر غور کیا جانے لگا۔ اُس وقت سے یہ ہوا کہ انسان دھندلے چل رہا ہے



اب تو وہ اس دنیا کے پردوں کو ہٹا رہا ہے۔ اُس کی گہرائیوں میں جھک  
 جھک کر نظر ڈال رہا ہے۔ اُس کے ورقوں کو الگ الگ کر رہا ہے۔  
 پہلے اُس کی حیثیت یہ تھی جیسے ایک کتاب میں نے آپ کو  
 دی۔ آپ نے اُس پوری کتاب کو لیکر اُس کے اوپر ایک غلاف چڑھا  
 دیا اور اُس پر لکھ دیا کہ یہ میری ملکیت ہے۔ دوسری صورت یہ  
 ہے کہ آپ چاہتے ہیں اُس کے ورقوں کو جدا جدا کر کے اُن کا مطالعہ  
 کر کے پوری کتاب کے متعلق کوئی رائے قائم کریں۔ یہ بہت دیر  
 کا کام ہے۔ چیز وہی ہے۔ مگر پہلے وہ اجمالی شکل سے بند  
 تھی اور اب وہ اپنے اجزاء کے ساتھ ساتھ کھلی ہوئی ہے۔  
 میں آخر میں وہیں پہنچ جاؤں گا جہاں پہلا انسان پہلے ہی پہنچ  
 گیا تھا۔ مگر اُسی وقت توجہ آخر تک پہنچوں۔  
 بیشک انسان ان اسرار و رموز میں پڑ کر اُس کی معرفت  
 سے دور ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ وہ قریب اس لئے کہ وہ  
 راستے میں ہے۔

اُس نے عناصر میں عناصر اور ابرزائے ترکیبی پیدا کئے ہیں۔  
 خرد میں اور دوزخ میں کن ایجاد سے اُس نے انتہائی چھوٹے  
 جراثیم اور کثیروں کا مشاہدہ کیا ہے۔



ان کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مجتمع ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی تنگ نظری سے یہ کہنے لگتا ہے کہ یہ دنیا ان ہی کیڑوں کی بنائی ہوئی ہے۔ بات یہ ہے کہ ذوق تحقیق نے اُس کو ایک وسیع عالم اسباب میں لاکر ڈال دیا ہے جس کی انتہا اُس سے بہت دور ہے۔

اس لئے وہ درمیان کی ہر کڑی کو انتہائی سمجھ لیتا ہے اور حقیقی انتہا سے بیخبر رہتا ہے۔ وہ ان تمام مادی اسباب کے منازل کو اگر طے کر لے اور آخر تک پہنچ جائے تو خدا کے وجود کی منزل آئے۔ لیکن وہ اس پورے سلسلہ کو طے کیونکر کرے ابھی تو سمندر کے وسط میں ہے۔

ایک وہ بچہ جو سمندر پر جہاز میں پیدا ہوا۔ ابھی اُس کو سال تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ اُس کی دنیا وہ سمندر ہی ہے۔ وہ کیسے سمجھے کہ خشکی بھی کچھ ہوتی ہے۔ آپ اُس سے لاکھ کہیں کہ یہ سمندر تو تم نے ابھی دیکھا ہے۔ اس کا ساحل ہوتا ہے۔ اُس کے آگے خشکی ہوتی ہے۔ درخت ہوتے ہیں۔ وہ اسے بالکل عجیب بات سمجھتا ہے کہ اس کے مشاہدہ اور اطلاع کی حدیں اس سے بہت مختصر ہیں۔



اسی طرح یہ انسان ہے۔ اس عالم امکان میں اپنی کشتی کو ڈالے ہوئے ہے۔ اگر یہ حدود مشاہدہ کا پابند ہے تو یاد رکھئے کہ یہ کبھی اس منزل تک نہیں پہنچے گا۔ اس لئے کہ کائنات کا وہ بیپایا دریا ہے جسے انسان کبھی طے نہیں کر سکتا۔

اس عالم میں اسباب و مسببات کی زنجیر اتنی ہی طولانی ہے جتنے اس عالم کے اجزاء ہیں۔ اب کتنی مشکل بات ہے کہ دنیا کے اس وسیع سلسلہ کائنات میں سے کسی ایک چیز کو لے کر ان لوگوں سے جو خالق کے وجود کے قائل ہیں یہ مطالبہ کیجئے کہ اس چیز کے وجود کا کیا سبب ہے۔ خالق نے اس کو کیوں پیدا کیا۔ جب یہ سمجھ میں آئے تو کہہ دیجائے کہ خالق کوئی ہے ہی نہیں۔

اس کو میں مثال دیکر سمجھاؤں۔ ریل گاڑی ہے۔ وہ جا رہی ہے آپ بھی ایک ڈبے میں تشریف رکھتے ہیں۔ گاڑی چلتے جاتے رک گئی۔ اُدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ اسٹیشن نظر نہیں آتا جھگل ہے۔ مگر گاڑی ٹھہری ہوئی ہے۔ اب آپ کو گاڑی رکنے کے سبب کی تلاش ہوئی۔ جس ڈبے میں بیٹھے تھے اُس کے نیچے دیکھا دیکھا چھت کو دیکھا دیواروں کو دیکھا۔ پتھروں کو دیکھا۔ پٹی کو دیکھا۔ سب ٹھیک۔ کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ پاس والی



گٹاری کو اسی طرح دیکھا کچھ سمجھ میں نہ آیا تیسری گٹاری دیکھی کچھ نہ معلوم  
 ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیوں گٹاری رکی۔ میں سوچتا ہوں کہ آپ  
 کبھی نہیں سمجھے گا کہ گٹاری کیوں رکی جب تک کہ اس پوری گٹاری  
 کے تمام ڈبوں کو طے کر کے انجن تک نہ پہنچے وہاں یہ راز منکشف  
 ہو گا کہ گٹاری کیوں رکی لیکن اگر آپ کے قدم سہی نے اس کے پیسے  
 ہی جواب دیر یا تو آپ کہتے رہے گا کہ میں نے بہت تحقیق کیا مجھ کو  
 پتہ نہ چلا کہ گٹاری کیوں رکی ہے۔ سبق ایک معمولی مثال ہو اس  
 نظام کی جو اس دنیا کے کائنات میں کار فرما ہے۔ آپ چاہتے ہیں  
 کہ اس میں کی ہر چیز کا سبب خود اس چیز میں مل جائے۔ یہ درخت  
 سے ایک پتہ ٹوٹ کر گرا۔ ہے بہت معمولی چیز مگر یہ پتہ کیوں گرا  
 وہ ہوا کا جھونکا چلا۔ وہ ہوا کا جھونکا کہاں سے آیا۔ یہ ایک  
 جھونکا ہوا کا معمولی چیز نہیں ہے۔ تمام عالم کائنات میں ایک  
 عظیم الشان انقلاب اور توجہ ہوا ہے جو آپ کو جھونکے کی  
 شکل میں محسوس ہوا اور اس کا ایک معمولی نتیجہ تھا کہ پتہ درخت  
 سے ٹوٹ کر زمیں پر گرا۔ اس ایک واقعہ کے سبب کو مکمل طور  
 پر آپ سمجھنا چاہیں تو تمام کائنات کو اپنے سامنے لائیے جس وقت  
 تک یہ پورا سلسلہ عمل و اسباب کا سامنے نہ ہو اس وقت تک



انسان ایک ایسے معمولی حادثہ کی ملت سمجھنے سے قاصر ہے۔

یہ نظام عالم آپس میں بالکل متصل اور ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ اگر انسان اس سلسلہ اسباب کی جستجو میں مصروف ہو جائیگا تو وہی عمر وفا نہیں کرے گی۔ وہ درمیانی راستے ہی میں رہ جائے گا۔ پھر گاڑی کے تمام ڈبے ختم ہوں اور انجن تک پہنچے تو معلوم ہوگا وہاں ایک ڈرائیور موجود ہے۔ جو اس تمام گاڑی کو چلا رہا ہے۔ اور اسی کے چلائے سے گاڑی چلتی ہے۔ اُس کے روکنے سے پوری گاڑی رُک جاتی ہے۔

ہم عالم کائنات کے ابتدائی حدود میں رہتے ہوئے اُس انتہائی منزل کا پتہ کیونکر لگائیں جو بالکل آخری اور سب سے اول ہے۔ سمندروں کی تہ میں رہنے والے جانوروں کو کیا معلوم کہ بالائی سطح سمندر کی ہم سے کتنی دور ہے۔ وہ تو بعد میں دیکھتے ہیں پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

ہماری حیثیت اس دنیا کے امکان میں بالکل ایسی ہے جیسے سمندر میں ایک قطرہ۔ اس کے باوجود ہم چاہتے ہیں کہ پہونچیں اس سمندر کے اُس آخری نقطہ تک جو اول بھی ہے۔ انسان اپنے مشاہدات کی دنیا میں ضرور گم ہو جائیگا اُسی طرح جیسے قطرہ سمندر کی بے نشان



ہو جاتا ہے۔

یہ وجہ ہے کہ خدا کی معرفت انسان کے لئے انتہائی دشواری۔

کسی چیز کو سمجھانے کے لئے دنیا میں دو طریقے ہوتے ہیں

**پانچواں سبب**

ایک اشارہ دوسرے الفاظ ایک گویا انسان جو

زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا اگر پانی مانگے تو اشارہ کرے گا۔ پانی کی

حقیقت کو سمجھانا چاہے گا تو پانی لا کر دکھا دیگا مگر ایک گویا انسان

جو قوت تکلم رکھتا ہے وہ اُس لفظ کو زبان سے کہہ دیگا جو اُس حقیقت

کو بتلائے۔ وہ عربی فارسی اردو وغیرہ جس زبان میں کلام کرنا چاہتا

ہے اُس زبان کی لفظ جو استعمال کرے گا یہ الفاظ ذریعہ ہونگے۔ اُس

حقیقت کو بتانے کے جو دوسرے تک پہنچانا مقصود ہے۔

یہی دو طریقے ہیں جن سے دنیا کی کوئی حقیقت سمجھائی جاتی ہے

ان میں واضح طریقہ لفظ ہی کا ہے۔ اشارہ محدود ہے اس میں

اتنی افادیت نہیں ہے جتنی لفظ میں مضمر ہے۔ الفاظ ہی کا ذریعہ وہ ہے

جو انتہائی کامیاب ذریعہ ہے حقیقتوں کو پہنچانے کا۔

خدا جس کو کہتے ہیں جس وقت میں ہم اُسے سمجھانا چاہیں تو اشارہ

کے حدود تو بہت پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں اس لئے کہ اشارہ ہمیشہ

مادی چیزوں کی طرف ہوتا ہے مگر مادہ کا شائبہ جہاں نہیں وہاں



اشارہ کی گنجائش ہی نہیں۔ جدھر بھی اشارہ کیا جائے اسی سمت کا نقطہ اس اشارہ کا مرکز قرار پائے گا۔ اس کو حکمائے قدیم یہ کہتے تھے کہ فلک الافلاک تک جا کر ٹھہرتا ہے۔

سامنے 'پس پشت' دہنے 'بائیں' فوق 'تحت'۔ یہ چھ مقابل کی جہتیں ہیں جو انسان کے تصور میں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان ہی کے دنیائی حدود ہیں۔ بات یہ ہے کہ تین طرح کی مسافتیں ہیں طول عرض او عمق۔ ہر مسافت کی ابتدا و انتہاء کے لحاظ سے دو جہتیں پیدا ہوتی ہیں طول کے لحاظ سے فوق و تحت۔ عرض کے لحاظ سے یمن و شمال۔ عمق کے لحاظ سے قدام اور خلف۔ جو جہتیں جسم میں فرض ہوتی ہیں۔ ان کی حد بندی کرنے والا فلک الافلاک قرار دیا جاتا تھا۔ سر کے اوپر کی جانب اشارہ کیا تو یہ خط موہوم فلک الافلاک تک پہنچا۔ پیروں کے نیچے کی طرف اشارہ کیا تو زمین کے طبقوں کو توڑتا ہوا یہ پھر فلک الافلاک تک پہنچا۔ اسی طرح دہنے اور بائیں اور سامنے اور پس پشت۔ یہ تمام اشارے آخر فلک الافلاک ہی تک پہنچتے ہیں۔

اب کی تحقیقات میں فلک الافلاک کچھ نہ سہی۔ بہر حال فضا محیط جس کی انتہا معلوم نہیں ہو سکی اسی کی طرف یہ تمام اشارے جا کر منطبق ہونگے۔ لہذا ان اشاروں کے حدود میں وہی چیزیں آ سکتی ہیں جو



ظلم لافلاک یا اس فضا کے محیط کے اندر ہوں لیکن اگر ایسی ہستی ہو کہ  
جوجہات کے حدود سے باہر ہے اس کے متعلق اشارہ کیونکر ہو سکتا ہے۔  
یہ اہل مذہب کا ایک تعبیری انداز ہے کہ انھوں نے خدا کے لئے ایک  
بلندی کی جہت کو مخصوص کر لیا ہے اس لئے دعا کو بھی ہاتھ اٹھاتے ہیں  
تو اوپر ہی کی طرف ورنہ حقیقتہً اُس کی ذات کے ساتھ فوق اور تحت  
کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ  
موجود ہے کہ۔

ایمَّاذِ تَوْافَیْہِمْ وَجْہُ اللّٰہِ جَدَّہِمْ یُخْرِجُہُمْ اُصْوَافُہُمْ  
لیکن یہ اعتباری حیثیت سے کچھ شایان شان نہیں معلوم ہوتا کہ  
پستی کی طرف اُس کی نسبت دیجائے اس لئے بلندی کی طرف ہاتھ  
اٹھاتے ہیں۔

پھر جب وہ تمام حدود و جہات کے بالاتر ہے تو اشارہ اُس کی طرف  
کیونکر ہو سکتا ہے۔

اچھا اب دوسرا ذریعہ یعنی الفاظ کا۔ یہ بہت ہمہ گیر ذریعہ ہے  
دنیا کی حقیقتوں کے سمجھانے کے لئے۔ کیونکہ اشارہ مادی چیزوں میں محدود  
ہے وہ بھی وہ جو ظاہری طور پر محسوس ہو سکیں اس لئے ہوا کی طرف  
اشارہ نہیں کر سکتے۔ یونہی کیفیتیں مثلاً درد، خوشی، رنج، بھوک، پیاس



ان سب کے بتلانے کا واضح اور آسان ترین طریقہ الفاظ کا ہی۔ لیکن اس آسان اور کامیاب طریقہ میں بھی ہم کو اس مقام پر دشواریاں محسوس ہو رہی ہیں۔ اس لئے کہ نقطیں ہماری پیدا کی ہوئی ہیں۔ ہمارا زبان۔ ہماری آواز۔ ہمارے ذہن نے ان تمام لفظوں کو خلق کیا ہے ہم نے حروف کی ایجاد کی۔ اُن کو آپس میں جوڑا توڑا مڑا اُن سے الفاظ کی تشکیل ہوئی۔ ہم نے اپنی ہی ضرورتوں کے لحاظ سے ان کو ایجاد کیا ورنہ الفاظ عالم تصور میں محدود نہیں ہیں۔

جس چیز کو سمجھانا ہوا ایک لفظ وضع کر لی۔ ضرورتوں کی بناء پر الفاظ کی تشکیل ہوتی گئی۔ اسی لئے آپ دیکھئے جتنا زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے نئی نئی ایجادیں ہوتی ہیں اور اُس کے ساتھ الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ایجادیں نہ تعبیر نقطیں بھی نہ تھیں جب ایجادیں تھیں تب نقطیں بھی ہو گئیں

علوم ہوا کہ الفاظ ہمارے روزمرہ کے ضروریات کے حدود میں محدود ہیں۔ پھر الفاظ میں اتنی وسعت کہاں ہو سکتی ہے کہ وہ اُس حقیقت کو بتلا دیں جو ہماری پیدا ہونے والی ضرورتوں کے حدود سے آگے ہے۔

ہم اُس کے بتلانے کے لئے مجبور ہو کر وہی الفاظ صرف کرتے ہیں



جو حقیقت ہم نے اپنے ماحول کی مطابقت سے وضع کئے ہیں۔ اس لئے وہ اُس کو پورے طور پر سمجھا نہیں سکتے۔

مثال کے طور پر یہ ہے کہ ہمارے افراد میں بعض کے لئے بعض چیزیں منکشف ہوتی تھیں اور بعض اُن کو نہیں جانتے تھے۔ ہم نے اپنے جاننے اور نہ جاننے کے لئے "عالم" اور "جاہل" کے الفاظ ایجاد کئے۔ مگر یہ علم ہم میں ایک صفت کی حیثیت رکھتا ہے جو ہماری ذات سے جداگانہ ہے۔ اب اگر ہم خدا کی اُس شان کمال ذاتی کو جو تمام اشیاء کے اُس کے سامنے منکشف ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے بتلانا چاہتے ہیں تو "علم" ہی کی لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس میں وہ بات ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ گویا یہ ذات سے الگ کوئی چیز ہے۔

یوں ہی ہم نے دیکھا کہ ہم کسی بات کو کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہم نے قدرت کی لفظ کو وضع کیا۔ لیکن ذات سے جداگانہ ہونے کی خصوصیت اس میں بھی موجود ہے۔

ہمیں کسی شے کو دیکھ کر تاثر ہوتا تھا اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ہم نے اُس کے لئے "رحم" کی لفظ وضع کی۔ جس کو اردو میں کہتے ہیں "ترس کھانا" اب میں چاہتا ہوں کہ خالق کی



وہ توجہ جو اُس کے بندوں کی طرف ہوتی ہے اُس کی مخالفت کے  
 قلعے سے اُس کو بچاؤں اس رحم کی لفظ سے۔ مگر اُدھر میں  
 رحم کما اُدھر ایک طرح کے نفسانی تاثر کا پہلو پیدا ہو گیا۔ ہم سمجھ  
 کہ اُس کا دل بھی اسی طرح کڑھتا ہے جیسے ہمارا حالانکہ یہ غلط ہے۔ یہ  
 چیزیں تو مزاج کا نتیجہ ہیں اور خدا طبعیت و مزاج وغیرہ سے  
 بری ہے۔

کوئی ہماری غلط دزدی کرتا ہے اور ناگوار طبعیت بات  
 کرتا ہے۔ ہم غصہ سے بھر جاتے ہیں۔ دل میں معلوم ہوتا ہے شعلے  
 بھڑک رہے ہیں جس طرح ایک خار ہو اُس میں آگ سلگ ہی  
 ہو لیکن منہ اُس کا بند ہو جس کی وجہ سے دھواں باہر نہ نکل  
 سکتا ہو۔ بس یہی حالت ایک مغلوب الغضب انسان کی غصہ  
 میں ہوتی ہے۔ خدا اپنی حکمت اور نظام عدل کی رو سے نافرمان  
 بندوں کو اپنی جانب سے سزا کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اُس کے  
 لئے ہم کیا لفظ استعمال کریں۔ مجبوراً وہی غضب کا لفظ استعمال  
 کرتے ہیں۔ لیکن نفسانی اور جذباتی کیفیت کا پہلو فوراً ذہن میں  
 آ جاتا ہے جو خدا کی شان کے شایاں نہیں ہے۔

اسی طرح ہماری طبعیت کو جھکاؤ کسی طرف پیدا ہوتا تھا ،



اُس کے لئے ہم نے لفظ ”محبت“ کی ایجاد کی تھی۔ اب وہ خاص تعلق جو خالق کو مخلوق کے ساتھ ہے جس میں اضافہ ہوتا ہے اطاعت شکاری کی وجہ سے اس کے لئے ہم کیا کریں۔ ہمیں لفظ نہیں ملتی۔ اس لئے مجبور ہیں۔ محبت ہی کے لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ہم جائزہ لیں تو جتنے الفاظ ہم خدا کے بارے میں استعمال کرتے ہیں اگر ان کے معنی پر غور کیا جائے تو سب سے ہی حالات و کیفیات کے متعلق ہیں اس لئے اگر ہم ذرا ذہن کو وسیع نہ کریں اور حقیقی مفہوم کو پابند بنالیں ان الفاظ کے ظاہری معانی کا تو وہ خدا خدا نہ ہوگا بلکہ وہ وہی ہوگا جیسے ہم سب ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ الفاظ اس احاطہ کمال تک پہنچتے ہی نہیں جو خدا کے شایان شان ہے اس لئے ایک بہت بڑی مشکل انسان کو اُس کے سمجھنے اور سمجھانے میں پیش آگئی کہ ہم الفاظ وہ کہیں جن سے مادیت ٹکیتی ہے اور مراد وہ ہو جو مادیت سے بالکل غلجہ ہے۔

ہر لفظ میں ضرورت ہوگی کہ حقوڑا سا معنوی تصرف کریں تب اُس پر اطلاق کریں  
نتیجہ یہ ہوگا کہ الفاظ پیچھے رہ جائیں گے اور مراد آگے نکل جائیگی۔



پھر اگر کوئی شخص اپنی عقل سے اُس کو سمجھے ہوئے نہیں ہو تو الفاظ نے اُس کو کیونکر سمجھایا جائے۔

انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جو بات کثرت کے چھٹا سبب ساتھ دیکھے اُسی کو عمومیت کا درجہ عطا کر دے۔

مثلاً کسی موضع میں شو آدمی ہوں۔ وہ لیک ایک کے متعلق دریافت کرے کہ فلاں شخص سید ہے؟ فلاں سید ہے۔ یوں ہی اسی نوے آدمیوں کے متعلق وہ پوچھے اور اُسے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سادات ہیں تو بقیہ کم تعداد افراد کے متعلق اب وہ دریافت نہ کرے گا خود ہی سمجھ لے گا کہ وہ بھی سادات ہیں اور اب جو کہیں بیان کرے گا تو وہ کہے گا کہ فلاں موضع میں سب سادات ہی سادات ہیں۔

یہ کیا ہے؟ وہی نادرا فرد کا غالب کے ساتھ منظم کرنا جو عام طور پر آسانی طبیعت میں مضمر ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انسان بعض احکام کلیہ کے طور پر ایسے بنالیتا ہے جو بعد تحقیقات کے غلط ثابت ہوئے ہیں کیونکہ اُس نے غالب افراد کو دیکھا تھا اور اُسے معلوم نہ تھا کہ شاید وہ نادرا کوئی فرد اُس کے خلاف بھی ہو۔

صول "استقراء" یعنی غالب افراد کو دیکھ کر کلی حکم لگانا

اس پر جب انسان چلتا ہے اور عالم وجود میں جائزہ لیتا ہے تو



کوئی چیز اُسے ویسی نظر نہیں آتی جیسا خدا کو بتایا جاتا ہے۔  
 وہ جہاں تک جستجو کرتا ہے ہر چیز حادث ہے، محدود ہے، مکان  
 و محل میں پائی جاتی ہے، عوارض و صفات کی حامل ہے اس کے بعد  
 انسانی کمزوری کہلا دیتی ہے کہ جو بھی موجود ہوگا وہ ایسا ہی ہوگا۔  
 یہ استقرار یعنی انسان کا جزئیات کو دیکھ کر حکم لگانا انسان  
 کو خدا کے راستے سے الگ کر دیتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آج کل بہت  
 بڑی سدرہ ہو رہی ہے۔ اس زمانہ میں طبیعتوں پر استقرار کا زیادہ  
 غلبہ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ آنکھوں کو بند کر کے عقل سے کام لیکر  
 اصول بنائے جاتے تھے۔ یہ اصول اب دنیا والے پسند نہیں کرتے  
 موجودہ زمانہ کے احکام جن پر سائنس کی بنیاد ہے۔ پہلے دیکھو پھر  
 کلیہ بناؤ۔

اسی بنا پر آپ دیکھیں گے کہ اس زمانہ میں خدا کے انکار کی  
 آواز زیادہ دہنوں سے آتی ہے۔ اس لئے کہ سابق و حال کے فلسفہ  
 کا طرز استدلال ہی بدل گیا ہے۔

اس زمانہ میں موجودات کو دیکھ کر کلیہ بنایا جاتا ہے ظاہری  
 کہ موجودات کو دیکھ کر جو کلیہ بنے گا وہ اُس دائرہ میں محدود ہوگا  
 جو اُن ہی موجودات کا دائرہ ہے۔ لیکن جو چیز کہ ان موجودات کے



حدود سے بالاتر ہو اور باعتبار ذات و حقیقت اُن سے بالکل علو ہو اُس پر یہ کلمے منطبق نہیں ہونگے۔

لیکن انسان کی افتاد طبع یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے جو کلمہ میں نے بنایا ہے وہ بالکل ٹھیک ہی ہے۔ جب وہ سنتا ہے کہ خدا اس طرح کی چیز نہیں ہے تو وہ انکار پر آمادہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ پھر وہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

انسان نے اپنے دماغ سے کچھ اعضاء جمع کر لئے  
ساتواں سبب ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ ہر چیز ان ہی اعضاء  
کے دائرہ کے اندر ہوگی۔ مثلاً حرکت اور سکون۔ ہر شے اُس کے  
خیال میں یا ساکن ہوگی یا متحرک۔ اسی طرح مختلف رنگ۔ وہ  
کسی شے کو پوچھتا ہے کہ وہ سیاہ ہے کئے گا نہیں تو وہ سمجھے گا پھر  
سفید۔ کئے نہیں تو وہ سمجھے گا زرد، سرخ وغیرہ۔

اسی طرح بڑائی، چھوٹائی، دوری، نزدیکی۔

یہ اعضاء اُس کے نزدیک وسیع اور جامع ہیں۔

لیکن جب خدا کو ماننے والے خدا کو پیش کرتے ہیں تو وہ

ان تمام اعضاء کی نفی کر دیتے ہیں۔

دنیا پوچھتی ہے وہ متحرک ہے، جواب ملتا ہے نہیں متحرک



نہیں ہے، تو پھر ساکن ہے؟ نہیں، ساکن بھی نہیں۔ سفید نہیں، سیاہ نہیں۔ کسی رنگ کا نہیں، پھوٹا نہیں، بڑا نہیں، دور نہیں، نزدیک نہیں، گھبرا کر گھبرا کر انسان صفتیں تلاش کرتا ہے اور جواب دینے والا نہیں نہیں کی رٹ لگاتے جاتا ہے۔

نہ مقدار ہے، نہ عدد ہے، نہ طویل ہے، نہ عریض ہے، نہ عمیق ہے، نہ رنگ ہے، نہ بو ہے، نہ مزہ

محدود ان خیال انسان اس نہیں نہیں، نہیں نہیں کو سن کر ایک مرتبہ کہہ دیتا ہے کہ پھر وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں واہ! ہے تو سب کچھ وہی، بلکہ جو کچھ ہے وہ اُس کی بدولت اب بھلا ایک انسان جو اس مادی احاطہ میں مقید ہو۔ ان مادی آنکھوں سے دیکھتا ہو، مادی کانوں سے سنتا ہو وہ کیا کرے، کیونکر ملنے لگیں طرح سمجھے؟ بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔

علم و ادراک کس چیز کا نام ہے؟ آپ اگر غور کریں گے **اٹھواں سبب** | تو معلوم ہو گا کہ وہ ایک طرح کا احاطہ ہے جو

ادراک کرنے والے کو اُس شے پر جس کا ادراک کیا ہے صاف ہوتا ہے، وہ اُسے گھیر لیتا ہے، اس کا نام ہے ادراک اس کے لئے جتنے الفاظ ہیں وہ ایک طرح کے غلبہ کا پتہ دیتے ہیں تاکہ



کے معنی ہیں ”پالینا“

”اطلاع“ اس کے معنی ہیں اور یہ کسی شے پر چھلنا ”واقعیت“ اس کے معنی ہیں کسی شے پر ٹھہرنا۔

عالم حقیقتہً معلوم پر محیط ہوتا ہے۔ اور یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ محدود کے لئے اعطاء غیر محدود کا غیر ممکن ہے۔ انسانی اور انسانی احساسات، انسان کا ذہن سب محدود ہے اور خدا جس کا نام ہے وہ لا محدود ہے۔ پھر محدود چیز اُس لا محدود کو کس طرح سے گھیر لے تاکہ اُس کا علم حاصل ہو۔

ایک ایسی دشواری ہے جو مخصوص اشخاص کے لئے  
**نواں سبب** پیش آتی ہے۔ وہ اپنے شخصی ماحول کا اثر ہے  
 انسان اگر ایسی فضا میں گھر جائے جہاں ہر شخص یہی کہہ رہا ہو کہ خدا کوئی جز نہیں تو انسان خود کرنے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو سکتا  
 میں سچ کہتا ہوں کہ آج کل جو بچے آپ کے گمراہ ہو جاتے ہیں  
 یعنی خدا کے وجود کے منکر ہو جاتے ہیں اُس کا بڑا سبب اُنکا  
 ماحول اور عقلمین کے ذاتی خیالات ہوتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں نے  
 پرورش پائی ہے لہذا مذہبیت کی فضا میں اور بچوں کو آپ بھی بتا رہے  
 ہیں اُس وقت جبکہ انھیں مذہبی معلومات حاصل نہیں ہو رہی ہیں



وہ بالکل خالی الذہن ہیں اس لئے جو نقش اُن پر جھلایا جائے وہ ابھر جائیگا اور پھر مٹنا اُس کا دشوار ہوگا۔

بچوں کو آپ اتنی مسموم فضا میں کبھی دیتے ہیں اُس وقت جبکہ کوئی تحفظ کا سامان اُن کے لئے آپ نے مہیا نہیں کیا ہے۔ شروع ہی سے اُن کے کانوں میں یہ آوازیں پڑنا شروع ہوتی ہیں کہ عقائد سب خرافات و ادہام کا مجموعہ ہیں۔ اب۔ اُن کے ذہن میں یہ بات اتر گئی کہ یہ باتیں سب مہمل ہیں، پھر ان پر غور کرنے میں پناہ کون ضائع کرے۔ بہت سے تعلیمیافتہ لوگ ایسے ہیں کہ اُنکے دل و دماغ پر فلاسفہ مغرب کا عقلی رعب چھا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ یہ سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے کہ جو کچھ اُن میں سے کسی فلسفی نے نظریہ قائم کر لیا ہے وہ غلط ہو اور ہمارے دقیانوسی خیال والے مذہبی رہنما جو کہتے ہیں وہ صحیح ہو بھی سکتا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ آخر اتنے بڑے بڑے فلاسفہ وہ بھی تو عقلائے زمانہ ہیں کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا کے وجود کا انکار کریں جبکہ وہ عقلی مشیت سے ایک ثابت حقیقت ہو۔





## ان مشکلات کا حل

گزشتہ حصہ بیان میں وہ دشواریاں دکھلائی گئی ہیں جو انسان کے لئے خدا کی معرفت کے سلسلہ میں درپیش ہوتی ہیں۔ بعض تعلیمات احباب نے ان بیانات کو سن کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ دشواریاں اس حد تک پہنچی ہوئی ہیں کہ خدا کی معرفت ہو ہی نہیں سکتی بالکل محال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتنے بیان کے انتہائی دلنشین سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اب دقت آیا ہے کہ ان مشکلات کو حل کیا جائے اور بتلایا جائے کہ خدا کی معرفت ممکن کس طرح ہے؟

اب تک جتنی بھی دشواریاں میں نے بیان کی ہیں وہ دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی ذات کی پوری معرفت حاصل نہیں ہو سکتی لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ جزوی معرفت بھی غیر ممکن ہے۔

دوسری قسم کی دشواریاں وہ ہیں جو انسان کے غلط طریقہ استدلال کے سبب پیدا ہوتی ہیں اس لئے عقل کی ہدایت سے اس ”زنیقہ“ استدلال ہی کو پس پشت ڈالنا چاہئے تاکہ خدا کے ماننے میں گمراہی نہ پیدا ہو۔



پہلی قسم وہ ہے جیسے میں نے کہا کہ انسان کا دماغ محدود ہے اور خدا کی ذات لامحدود۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اگر اُس کی ذات و صفات پر تمام و کمال اطلاع حاصل کرنا چاہے تو غیر ممکن ہے اس لئے کہ محدود لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر آپ کسی چھوٹی چیز کو بڑی چیز پر لا کر رکھئے تو یہ بھی نہیں ہے کہ چھوٹی چیز بڑی کا کوئی حصہ بھی نہ لے سکے۔ سمندر میں ایک سوئی ڈبوئے تو اُس کے ناکہ کی بساط بھر پانی اُس میں ضرور سما جائیگا۔ اگرچہ سمندر اپنی وسعت سمیت بیشک سوئی کے ناکہ میں نہیں سما سکتا۔ پھر آپ سے یہ کون کہتا ہے کہ خدا کے ذات و صفات کا انتہائی علم حاصل کیجئے مگر آپ اپنے ذہن کو اُس کی ذات کی طرف متوجہ کیجئے اور غور و خوض سے کام لیجئے۔ جتنی سمائی دماغ میں ہوگی اتنی تو معرفت اُس کی حاصل ہی ہو جائیگی۔

پھر انسان کا دماغ بھی عجیب نوعیت رکھتا ہے۔ یہ خود بڑھانے سے بڑھتا ہے اور گھٹانے سے گھٹتا ہے۔

انسانی دماغ کی وسعت کوئی مادی وسعت تو ہی نہیں۔ نہ یہ سمائی مادی سمائی ہے یعنی معلومات اُس میں یوں تو آتے نہیں جیسے ڈیبا میں پان بھرے جاتے ہیں۔ یہ انسانی دماغ غور و فکر



کرنے سے بڑھتا ہے اور جتنا بڑھے گا اتنی سمائی زیادہ ہوگی۔  
 معرفت جن حقائق سے متعلق ہے وہ لامحدود وسعت رکھتے ہیں  
 اور ان میں زیادتی و کمی نہیں ہے۔ نہ ان کی کوئی مقدار مقرر ہے  
 نہ ان میں تغیر ہے نہ تدریج و ترتیب۔ مگر چونکہ اُس معرفت کا  
 حاصل کرنا بقدر وسعت ادراک بشری ہے اس لئے کچھ تودماغی  
 صلاحیت ہی کو اعتبار سے فرق ہوتا ہے یعنی کچھ انسان وہ ہیں  
 جن میں ذاتا قابلیت ہی کم ہے۔ اور ایک محدود دائرہ کے  
 اندر وہ ترقی کر سکتے ہیں۔ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور کچھ استعمال  
 کی وجہ سے فرق ہوتا ہے یعنی جتنا دماغ صرف کیا اتنی دماغ میں  
 وسعت پیدا ہوتی گئی۔ ہر دو میں یکلف ہے اور اس کا فرض ہر  
 اتنی ہی معرفت کا جتنی اُس کے دماغ کے لحاظ سے اُس کے  
 امکان میں ہے اور پھر اُس کے آگے بڑھنا اُس کی سعی و طلب سے  
 متعلق ہے جتنا بھی آگے بڑھ جائے پھر بھی یہ محدود ہے اور وہ  
 لامحدود ہے۔ محدود و انتہائی ترقی کر کے بھی لامحدود تک نہیں پہنچ  
 سکے گا اس لئے اگر قلاب قوسین تک بھی پہنچ جائے تو کہے گا  
 ”ما عرفنا حق معرفتنا“ جتنا حق پہچانے کا تھا اتنا نہیں  
 پہچان سکا۔



اب اگر انسان کے دماغ میں صلاحیت ہی کم ہے تو اُس کو سزا نہ ملے گی اُس درجہ تک نہ پہنچنے پر جو اُس کے امکان سے باہر تھا۔ اس معنی سے کہا گیا کہ ایمان کے درجے ہیں۔ سلمان فارسی اگر نو درجہ پر ایمان کے فائز ہیں تو ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک اس کا مکلف نہیں ہے کہ اتنی ہی معرفت حاصل کرے جتنی سلمان کو حاصل تھی۔ اور اگر صلاحیت بالکل نہ ہو تو ذمہ داری بالکل نہیں ہے جیسے دیوانہ۔ یہ حقیقت انسان نہیں ہے۔ جیسے دوسرے جانور ویسے وہ کیونکہ انسانیت درحقیقت نام ہے اُس باطنی شے کا جس کا نام ہے قوت ادراک۔ وہ اگر معدوم ہے تو صورت انسان کی سی ہو لیکن حقیقت میں نہ انسان نہیں ہے۔ اس لئے اُس پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کسی نے دیوانہ سے نہیں کہا کہ تو خدا کی معرفت کیوں نہیں حاصل کرتا۔ بس جب ہم کو ایک فرد کامل کو تاہی دماغ کی مل گئی یعنی مجنون اور اُس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا تو اسی سے ہم درجے قرار دے سکتے ہیں اور اُسی کے لحاظ سے احکام میں توازن قائم کر سکتے ہیں۔

ایک نیم دیوانہ یعنی مجنون اور عاقل کے درمیان منزل رکھنے والا انسان جس کو کہتے ہیں سفیہ یعنی خبطی، اس سے کم درجہ والا۔ یعنی کمزور عقل رکھنے والا جس کو کہتے ہیں احمق اور بوقوت، ہر ایک میں



ذمہ داری اُس مقدار بھرے جس قدر اُس کی عقل ہے۔

اس کمزور عقل والے انسان میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہو کہ وہ زیادہ سمجھ کے تو کہے اس سے یہ چاہا جاسکتا ہے کہ وہ بوجہ سنیابن جاگے وہ بس جس قدر اپنی امکانی کوشش صرف کر کے سمجھ لے وہی اُس کی آخری حد ہے۔ اُس کو سزا نہیں دی جاسکتی کہ تم نے اس سے بڑھ کر کیوں نہ حاصل کیا۔

بیشک اُسے جزا کا بھی اس سے زیادہ استحقاق نہیں ہے۔ یعنی اُس کو ایسا اعزاز دیدیا جائے جو اُس کی شان سے بالاتر ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ہم نے مانا کہ وہ بے قصور ہے۔ اس کا نتیجہ صرف اتنا ہے کہ اُسے سزا کا مستوجب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ لیکن کوئی ایسا عمدہ و منصب یا اعزاز و اختصاص جو نتیجہ ہے ایک خاص درجہ کے کمال انسانی کا۔ وہ اس ناقص شخص کو کیوں دیا جائے؟

فرض کیجئے کہ آپ نے کوئی انعام مقرر کیا ہے اُس شخص کے لئے جو ایک خاص سوال کو حل کر دے۔ اخباروں میں اس طرح کے انعاموں کا آج کل بہت اعلان ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اُس سوال کو حل نہ کر سکے۔ اور مان لیجئے کہ محنت کی کمی یا غور و خوض



میں کوتاہی کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔ اُس نے رات رات بھر کون دن بھر غور کیا، کوشش کی مگر اُس کے دماغ میں صلاحیت ہی نہیں تھی۔ بیچارہ ہے ضرور وہ قابلِ رحم۔ بیشک اگر کوئی اُسے سزا دینا چاہے۔ اُسے قید کرے۔ مارے۔ تکلیف دے اس بات پر کہ اُس نے سوال کا ٹھیک جواب نہیں دیا تو یہ اُس پر زیادتی ہوگی ظلم ہوگا۔ لیکن وہ انعام اُس کو مل جائے، اس کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر آپ نے وہ انعام اُس کو دیدیا تو یہ اُن لوگوں کے ساتھ نا انصافی ہوگی جو قابل اور لائق تھے اور جنہوں نے سوال کا واقعی صحیح جواب دیا تھا۔

یوں ہی سمجھ لیجئے ثواب کو جس طرح مجنون سے عقاب ساقط ہے اُسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ اُس کو ثواب عطا کیا جائے۔ کہئے کہ وہ بیچارہ ہے بے بس ہے۔ بیشک ایسا ہی ہے۔ مگر اس کے لئے اتنا کافی ہے کہ اُس کو سزا نہ دی جائے۔ یہی کیا کم ہے۔ جن کو جزا ملتی ہے اُن کو بُرائی کرنے پر سزا بھی تو ملتی ہے! سزا و جزا دونوں متقابل چیزیں ہیں۔ آپ سزا میں تو اس اصول کو تسلیم کریں لیکن جزا میں اُس کو شریک کرنا چاہیں۔ یہ درست نہ ہوگا۔ فرض کیجئے کہ دیوانہ پن کی تدوین صبح سے شام تک کھڑا ہوا وہ



نمازیں پڑھے جائے۔ اس نماز کا ثواب کیوں اُس کو دیا جائے۔  
جبکہ ہی اگر کسی کو مارتا پیتتا تو سزا اس کو نہ دیکاتی۔

بس اسی طور سے کمی عقل کے مراتب کو سمجھ لیجئے۔ جتنی عقل اتنی  
جزا و سزا۔ دماغ اپنے تنگ ہونے کی وجہ سے ایک محدود نقطہ  
تک معرفت حاصل کرتا ہے تو بس اُسی نقطہ پر اُس کو جزا ملنا  
چاہئے۔ بیشک سزا نہیں ہو سکتی کہ اس سے زیادہ معرفت کیوں  
حاصل نہ کی۔ اسی لئے پیشوایان اسلام کے احادیث میں یہ بتلایا  
گیا ہے کہ انسان کو بمقدار عقل جزا دی جائیگی۔ وہ مذہب اور ہیں  
جو عقل پر پرہیز بٹھاتے ہیں۔ اسلام کے تو درحقیقت یہ خصوصیات  
ہے کہ وہ عقل کو آواز دیتا ہے۔ عقل ہی کو معیار قرار دیتا ہے  
امام فرماتے ہیں العقل مایرضیٰ بہ الرحمن ویکتب علی الجنان "عقل  
وہ ہے جس کے ذریعہ سے خدا کو رضا مند کیا جاتا ہے اور جنت کو  
حاصل کیا جاتا ہے۔"

عقل انسان کی جس قدر ہوگی اُسی قدر اُس کو بدلا ملے گا اس لئے  
کہ اطاعت کی بنیاد معرفت پر ہے اور معرفت کا تعلق عقل کے ساتھ  
ہے۔ بس جتنا انسان کا دماغ، اتنا ہی معرفت کا امکان اور اس کے  
زیادہ انسان سکلف نہیں۔



بیشک جتنی وسعت انسان کے دماغ میں ہے اُس سے کام لینا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے یہ قابلِ مواخذہ ہیں لیکن اپنی صلاحیت کے موافق جدوجہد کرے تو یہی اُس کے لئے کافی ہوگا۔ وہ اپنی وسعت دماغ کے مطابق خدا کے لامحدود صفات کا کچھ نہ کچھ تو ادراک کر رہی گا۔ یہی اُس کے کاظم سے معرفت کا امکانی درجہ ہوگا۔

رہ گئی خدا کی ذات اور اُس کے کمال ذاتی کی اصلی حقیقت کی معرفت، اُس کا ہر انسان سے مطالبہ نہیں ہے، اور نہ وہ ہر انسان کی قدرت میں ہے۔

بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ خدا کی اصل ذات حقیقت کی معرفت انسان کے لئے بالکل غیر ممکن اور محال کا درجہ رکھتی ہے جس کے کسی شخص کے لئے کسوت میں بھی عالم وقوع میں آنے کا امکان نہیں ہے ذات کہتے ہیں ایک خاص شخصیت وجود کو۔ ذات مفہوم کا نام نہیں ہوتا۔ ذات کئی اوصاف کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ زید کی ذات کیا ہے؟ یہ وجود خاص۔ یہ خصوصیت کبھی مفہوموں کے اجتماع سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ مفہوموں کو جتنا ملایا جائے وہ ہمیشہ کٹی ہی رہیں گے۔ اُن کے دائرہ میں وسعت ہی رہے گی۔ اُن میں شخصی خصوصیت



پیدا نہیں ہو سکتی۔ زید کے یہاں اُس کے گھر میں ایک مولود کی  
 ولادت ہوئی جس کا نام ہے خالد۔ آپ اوصاف و مفاہیم کے  
 ذریعہ سے اُس کے تعین ذات کا فائدہ حاصل کیجئے، غیر ممکن ہے  
 کہنے کہ فلاں وقت متولد ہونے والا بچہ۔ تو کیا یہ مفہوم ایک  
 ہی میں منحصر ہے؟۔ اس وقت پر اگر ہر ایک بچے متولد ہوتے تو ان  
 سب پر یہ مفہوم منطبق ہوتا۔ آپ ایک خصوصیت اور بڑھائیے کہنے  
 کہ فلاں گھر میں فلاں وقت پر متولد ہونے والا انسان۔ دائرہ  
 محدود ضرور ہے۔ مگر کیا وہ ایک سے مخصوص ہو گیا۔ اب بھی  
 اگر اسی مکان میں اسی وقت پر کوئی اور بھی ہوتا تو یہ مفہوم اُس پر  
 بھی منطبق ہوتا۔ اب اس میں اور خصوصیت بڑھائیے۔ کہنے کہ  
 فلاں ماں باپ سے فلاں وقت پر فلاں مکان میں متولد ہونی والا  
 فرزند۔ اب بہت خصوصیت پیدا ہو گئی۔ یہ بالکل واضح مفہوم  
 ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ انہی ماں باپ کے یہاں اس وقت  
 اسی جگہ یہ نہ متولد ہوتا۔ اور کوئی ہوتا تو اُس پر یہ مفہوم صادق آتا  
 الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جائیگا۔ مفاہیم کی سرحد تمام ہو جائیگی۔ مگر وہ  
 خصوصیت پیدا نہیں ہو سکتی جو شخص کو شخص بنادے اور جس میں  
 شرکت غیر کی گنجائش نہ ہو۔ جزئیت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟



کوئی وصف نہ بتائیے۔ بجا کر دکھلا دیجئے کہ ”یہ“ بس اس ”یہ“ کے ہوتے ہی وجود خاص کا مفاصل حاصل ہو گیا۔ ذات کی تعیین ہو گئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جزئیات کبھی کلیوں کے آپس میں ملا دینے سے نیا رہتیں ہو سکتے۔ کلیات بس ایک دوسرے سے ملیں گے تو وہ کلی ہی رہیں گے۔ جزئی نہیں بن سکتے۔

مجمع میں سے کسی کی طرف سے سوال، جزئیات اضافی میں تو یہی ہوتا ہے۔

(جواب) جزئیات اضافی حقیقہ ”جزئی ہوتے ہی کب ہیں“ انھیں ”اضافی“ کہے کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ بجائے خود کلی ہیں۔ جزئی نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ بجائے خود آپ ہزار مفہوم یکجا کر دیجئے پھر بھی ان میں وسعت ہی رہے گی۔ یہ اور بات ہے کہ اتفاق سے اسکی ایک ہی فرد موجود ہو لیکن اس کی وجہ سے اس کی ذات خصوصیت کی حامل نہ ہوگی۔ غوموں کے سمٹنے سے ذات کی تشکیل کبھی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ذات کا ادراک اُسی وقت ہوگا جب اُس کا شخص و تعین انسانی ادراک کے حدود میں آجائے۔

اب دیکھئے کہ: ات باری کا تعین اگر انسان کے حدود ادراک میں



آجائے تو وہ محدود ہو جائیگا۔ انسان کو وہاں یہ کہنے کی گنجائش ہی نہیں ملتی اس لئے کہ اُس کا دماغ خیال تمام قوائے عقلیہ مگر بھی اُس شخص خاص کی صورت گری سے عاجز ہیں۔ ہمارا ادراک تو بس اپنے ہی ایسے تعینات تک محدود ہے۔ لیکن خدا کی ذات یعنی اُس کا اصل وجود معین، وہ ہمارے ذہن میں آجائے اور ہم اسے سمجھ لیں یہ غیر ممکن ہے۔ انسان چاہے کتنا ہی بلند ہو جائے، کتنی ہی معرفت زیادہ حاصل کر لے مگر یہ بات اُس کے لئے کبھی نہیں حاصل ہو سکتی۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لئے امیر المومنین ارشاد فرماتے ہیں۔

لا یلک بعد الہم ولا بنالہ غوص الفطن۔

”اُس تک نہیں پہنچ سکتی دور بینی ہمتوں کی اور نہ اُس کو پائی ہے غوطہ خوری عقلوں کی۔“

یہ نہیں ہے کہ معمولی درجہ کی ہماری آپ کی عقلیں نہیں پہنچ سکتیں بلکہ بالکل نفیم ہے۔ دنیا کی کوئی عقل اُس نقطہ تک نہیں پہنچ سکتی

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

هو القادر الذی اظاہر قمت الا وہام لتدرک منقطع قدر  
وحادل الفکر اندر اُمن خطرات الوساوس ان یقع علیہ فی عمیقاً



غیوب ملکوتہ و تو لھت القلوب الی التجری فی کیفیۃ صفاتہ و غمعت  
مد اخل العقول فی حیث لا تبلغہ الصفات لتناول علم ذاتہ  
و دعما وھی تجوب مھاوی مدون الغیوب متخلصۃ الی سبحانہ  
فرجت اذ جھت معترفۃ بانہ لا ینال بجور الاعتساف کنہ  
معرفتہ ولا تخطر بال ادی الرویات خاطرة ان فقدار  
جلال عزتہ .

یہاں زور بڑھا دیا گیا ہے کلام کا زمانے میں۔

”وہ ایسا با اقتدار ہے کہ جب تو ہمارے ہاتھ پاؤں مار رہے  
ہوں اس غرض سے کہ اُس کی قدرت کی آخری حد کو دریافت  
کریں اور دوسو سوں کی آمیزش سے پاک و صاف فکر قصد کرے  
اُس تک پہنچنے کا اُس کی عظمت کی غیبی گہرائیوں میں اور دل  
اُس کی طرف متوجہ ہوں تاکہ اُس کی صفات کی کیفیت کو جان لیں  
اور عقلیں گہرائیوں کی اُن حدوں میں داخل ہوں جہاں الفاظ پہنچ  
نہیں سکتے اُس کی ذات کا علم حاصل کرنے کے لئے تو وہ ڈانٹ  
دیتا ہے ان سب کو اس حالت میں کہ جب وہ طے کر رہے ہیں  
گہرائیوں کو غیبی تاریکیوں کی صرف اُسی کی طرف لو لگائے ہوئے  
بس فوراً یہ پلٹ آتے ہیں دھٹکا کھا کر اقرار کرتے ہوئے کہ روپ



کی زیادتی سے اُس کی معرفت کی اصلی حقیقت حاصل نہیں ہو سکتی اور صاحبان فکر کے دل میں اُس کے عزت و بزرگی کی حد مقرر کرنے کا خیال گردش نہیں کر سکتا۔

یہ درحقیقت ذات الہی کی معرفت کی منزل ہے جو انسانی حدود امکان سے باہر ہے اس لئے ہمارا کام کیا ہے؟ ہمارا کام یہ ہے کہ اُن قریب ترین اوصاف کو تلاش کریں جن کی حقیقت اُس کی ذات میں پائی جاتی ہے لیکن اُس طرح نہیں جیسے ہم میں ہے۔ ہم عقل سے کام لے کر اُن نقائص کو تو دور کر دیں جو اُس صفت میں ہماری ذات سے متعلق ہیں اور اُس کا جو ہر کمال اپنے حدود و ادراک میں خدا کی ذات کے لئے ثابت کریں۔ یہ خدا کی معرفت وہ ہے جو انسان کے حد امکان میں ہے اور اسی کا وہ مکلف ہے۔ یہی میں مختلف مراتب و درجات پیدا ہوتے ہیں اور ترقی و تنزل کی گنجائش نکلتی ہے۔

دوسری قسم اُن مشکلات کی وہ ہے جن کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اُن مادی معیاروں کو جو اُس نے تمام اشیاء کے جاننے کے لئے مقرر کئے ہیں خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہے تو غلطی کرے گا اور اُس کی معرفت تک نہیں پہنچ سکے گا۔ لیکن یہ خود انسان کی غلطی



ہوگی کہ اُس نے طریقہ غلط اختیار کیا۔  
 اُس کے لئے مثال بیشک نہیں ہو سکتی اس لئے کہ لیں کمثلہ  
 شیء "اُس کی ایسی کوئی چیز ہی نہیں ہے"۔

لیکن اگر ہم عقل سے کام لیں تو یہی مثالیں اُس تک پہنچا بھی  
 سکتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ دنیا کی ان تمام چیزوں میں ہم نقائص اور  
 کمالات کی پہلو کی تلاش کریں۔ پھر ان تمام نقائص کی ہم نفی کر کے محض  
 کمال پر اپنے زاویہ نگاہ کو مجتمع کر لیں تو وہی نقطہ حقیقت ہو گا جو ہماری  
 اصلی منزل ہے۔

طبیعت مادی چیزوں سے مانوس ہے، بے شک مگر خود انسان  
 کی نہاد میں غیر مادی پہلو موجود ہے جو حقیقتہً اس کی انسانیت کا جوہر خاص  
 ہے وہ اس کو خدا کی معرفت سے بالکل قریب کر دیتا ہے لیکن اس کو  
 اپنی خودی کا احساس ہونا چاہئے تو یہ خود شناسی "خدا شناسی" کا  
 ذریعہ قرار پائے گی۔

وجود کے سمجھنے کے لئے عدم کی ضرورت، یہ صرف "تجربہ" کے طریقہ  
 میں محدود بن جانے کا نتیجہ ہے لیکن عقلی ادراکات تجربہ کے محتاج نہیں  
 ہوتے۔ وہ موجودات کو دیکھ کر ہی موجد کا پتہ دیتے ہیں اور حکم لگاتے  
 ہیں کہ بغیر موجد کے یہ تمام اشیاء موجود نہیں ہو سکتے تھے اگرچہ اُس کے



مردم ہونے کا کوئی تجربہ نہ ہوا ہو۔

انسان عالم کائنات کی سیر میں مصروف ہے مگر خالق کا پتہ لگانے کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ان تمام کائنات کا مطالعہ کر لے بلکہ ان میں کسی ایک چیز ہی کو لے کر اگر وہ غور کرے تو اُس کی سمجھ میں آجائے گا کہ اس کے اسباب و علل کی درمیانی کڑیاں جو کچھ بھی ہوں لیکن آخر میں اُس کی انتہا واجب الوجود خالق پر ضرور ہے۔

اشارہ خدا کی ہستی کو معین کرنے میں یقیناً بے کار ہے۔ اور الفاظ بھی اُس کی کنہ حقیقت اور واقعی صفات کی صورت کو نہیں بتا سکتے لیکن ان الفاظ کے ذریعہ سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے اُن میں تھوڑے سے عقلی اثر کے ساتھ انسان اُس کمال ذاتی کاپتہ دے سکتا ہے۔ عقل کو صرف کرنے کی بیشک حاجت ہے۔ لیکن اس سے انسان کو مغربی کہاں ہے۔

”استقرار“ یعنی اکثر جزئیات کی بناء پر یہ کلی حکم لگانا بھی حقیقت کا آئینہ بردار نہیں ہو سکتا۔ یہ طریقہ ہی بالکل غلط ہے جب وہ حقیقت ہے ہی ایسی کہ اُس کے مثل کوئی دوسری چیز نہیں تو ان چیزوں کے مشابہہ اور تنبیہ سے جس حکم کی تشکیل ہوگی وہ اس ذات پر مطبق کیسے ہوگا۔

انسان کے ذہن نے اضداد مقرر کر لئے ہیں مگر ان اضداد کا جو محل ہے اُسے بھی دیکھنا چاہئے۔ وہ اجسام ہیں جن میں یہ کتبہ یقیناً شکیک



جسم بیشک یا متحرک ہوگا یا ساکن لیکن جسم ہی نہیں ہے تو حرکت یا سکون کا  
 ڈھونڈنا بالکل غلط ہے۔ اسی طرح رنگ اور شکل، یہ بھی جسم ہی سے متعلق  
 ہے جو چیز جسم نہ ہو اُسے سفید یا سیاہ وغیرہ فرض کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔  
 قیاس بجائے خود صحیح بھی ہو تو جہاں فارق موجود ہو وہاں قیاس ہرگز  
 صحیح نہیں ہے۔ دنیا کی سب چیزیں ایسی ہیں تو خدا کو بھی ایسا ہی ہونا  
 چاہئے مگر یہ تمام چیزیں جس طرح کی ہیں اُس طرح کا خدا ہو تو یہ تمام احکام  
 اُس پر جاری ہوں۔

اور جب وہ حقیقت ہی ان تمام اشیاء سے مختلف ہو تو ان تمام احکام  
 کے وہاں جاری کرنے کا کیا حق ہے۔  
 خدا کی مسمیٰ کا ادراک قطعاً تجربہ و مشاہدہ، مستقرا و تمثیل کا نتیجہ نہیں  
 ہو سکتا۔ وہ انسان کے جو عقل سے متعلق ہے اور عقل انسانی ہی وہ ہے  
 جو ایک لامحدود فضا میں پرواز کر سکتی ہے۔ اسی کے اوپر علوم و فنون  
 کی بنیاد ہے کیونکہ اصول و ضوابط اور کلیات کبھی حدود مشاہدہ میں آکر  
 نہیں ہو کر تے

ان علوم کو جانے دیجئے جو بالکل نظری ہیں۔ وہ فنون و علوم جو  
 احساس سے بالکل قریب ہیں اور ان میں غلطی نہیں ہوتی یا بہت کم  
 واقع ہوتی ہے۔ وہاں بھی کلیات ہمیشہ مشابہات کے آگے ہوتے ہیں مثلاً



تین اور تین کا مجموعہ چھ۔ اس کو آپ کیسے سمجھے؟ کیا اس طرح کہ تین آدمی اور تین آدمی شمار کئے چھ ہوئے۔ تین درخت اور تین درخت گئے چھ ہوئے۔ تین پتھر اور تین پتھر دیکھے چھ ہوئے۔ اس طرح کے دس میں پچاس مشابہات سے ہم سمجھے کہ تین اور تین کا مجموعہ چھ ہوتا ہے۔

ہرگز نہیں! ورنہ میں کوئی چیز فرض کرونگا جسے آپ نے شمار نہ کیا ہو اور کونگا کہ ممکن ہے وہاں تین اور تین کا مجموعہ دس ہو جاتا ہو۔ مثلاً تو ایک محدود چیز ہے۔ اُس سے آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ اور ہر جگہ مجموعہ اتنا ہی ہوگا۔ یہ ہمیشہ "اور" ہر جگہ "جہاں پر آیا مشاہدہ نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اور آپ کا علم و ادراک مشاہدہ سے آگے نکل گیا۔

فن ہندسہ میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ایک مثلث کے تینوں زاویے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں۔ میں پوچھوں کیوں؟۔ آپ کہیں ہم نے ایک مثلث بنایا۔ اُس کے نہ وایا کو نایا۔ اور قائم تین کو نایا تو وہ برابر ہوئے۔ میں کونگا کہ آپ نے کے دفعہ نایا تھا ہر گز دس دفعہ۔ میں عرض کرونگا کہ ممکن ہے گیارہویں دفعہ آپ نانتے تو ایسا نہ ہوتا۔ ہر ایسی فرد جو مشاہدے سے باہر ہے اُس کے متعلق آپ کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ آپ اُس پر بھی حکم لگا دیں۔ عقل جو



حکایت بنائے گی، اُس کے معنی یہ ہونگے کہ وہ مشاہدات و حسیات سے  
بلند ہیں۔

ہمارے سابقہ زمانہ کے حکماء نبض دیکھ کر بخار کی تشخیص کرتے تھے۔  
موجودہ زمانہ میں جب مشاہدہ کی قوت پر سب کچھ ہوتا ہے، تھرمامیٹر لگاتے  
ہیں۔ واقعی کیا یہ آنکھ سے دیکھ کر شناخت ہو رہی ہے؟ نہیں! جس  
اصول پر وہ مبنی تھا۔ اُسی پر یہ بھی مبنی ہے۔ وہ قوت لامسہ سے  
کام لے کر ایک کیفیت کا ادراک کرتے تھے۔ اور اس کیفیت سے  
بخار کا اندازہ کرتے تھے اس بنا پر کہ بخار میں اور اس طرح کی کیفیت  
میں تلازم سمجھتے تھے۔ آپ نے قوت لامسہ کے بجائے باصرہ سے  
کام لیا۔ سچ بتائیے تھرمامیٹر میں اُس کا بخار ہے جو دکھلائی دے  
رہا ہے؟ بخار تو بہر حال نادیدہ چیز ہے۔ یہ پارہ ہے جو دکھائی  
دے رہا ہے مگر آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مقدار حرارت اور پارہ کی رفتار  
میں ایک خاص تلازم موجود ہے۔ اس بنا پر آپ پارہ کی ترقی  
سے بخار کی زیادتی کا اندازہ کرتے ہیں۔

دماغ بھی ذریعہ استدلال حسی تھا۔ لیکن بنیاد استدلال عقلی تھی  
آپ کے یہاں بھی یہی صورت موجود ہے۔

حقیقت آپ کے سائنس کی بنیاد صرف اسی پر ہے کہ ان کو دیکھ کر



موثر کا پتہ چلا یا جائے۔

قوت مشاہدہ آپ کی صرف آثار کے احساس میں کام کرتی ہے لیکن نتیجہ ہر حال حیرتی ہوتا ہے۔ پھر اہل مذہب جو استدلال آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ بھی تو یہی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ آنکھیں بند کر کے خدا کے وجود کا اقرار کرو۔ وہ بھی آثار کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ یہ آثار سبب سے ہیں۔ عالم کائنات آنکھوں کے سامنے موجود ہے ان کو دیکھئے اور پھر عقل سے موثر کا پتہ لگائیے۔ یہ بالکل وہی اصول ہے جو دنیا کے تمام نتائج میں جاری و ساری ہے مگر یہاں آپ کہتے ہیں کہ اس موثر کو تو ہم نے دیکھا نہیں۔ آخر ایک ان دیکھی چیز کو ہم تسلیم کس طرح کریں۔

حالانکہ دیکھنے کا تعلق ہر چیز میں صرف آثار کے ساتھ ہے وہ یہاں بھی محسوس ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم علماء مذہب کے خدا کے وجود کے متعلق دریافت کرتے ہیں بس وہ پرانے زمانہ کے اصطلاحات و روش تسلیم و معلول۔ واجب و ممکن وغیرہ پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے ہمارا دم گھبراتا ہے۔ حقیقت انسان کی کوتاہ نگاہی ہے یہ تو دنیا کی ہر چیز میں اصطلاحات مقرر ہو گئے ہیں حقیقت ان اصطلاحات







# معرفت خدا کی ضرورت

اور

## انٹائن کی عملی زندگی پر اسکا اثر

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی معرفت کی ضرورت ہی کیا ہے۔  
 کوہ کندن و کاہ بر آوردن۔ اتنے مشکلات کو حل کیا، دشوار گزار  
 منزلیں طے کیں پھر ہوا کیا؟ صرف یہ کہ ایک ایسی ہستی کو جسے کبھی نہیں  
 دیکھا سمجھ لیا کہ وہ موجود ہے۔ پھر اُس کے سمجھنے سے ہمارا فائدہ؟ اور نہ  
 سمجھتے تو ہمارا نقصان؟

وہ کہتے ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے۔ ہوگا۔ مگر  
 ہمیں اس مسئلہ پر غور کرنے ہی کی ضرورت کیا ہے۔ وہ ہے تو ہمارے  
 نہ سمجھنے سے وہ معدوم ہو نہیں جائیگا۔ وہ بہر حال موجود رہے گا۔  
 رہ گیا ہماری زندگی کا نظام وہ ہمارے کردار سے متعلق ہے۔ اُس  
 میں اعتقاد کو کوئی دخل نہیں ہے۔

نئی دہلی کے جلسہ میں گذشتہ سال میرے لئے موضوع جو مقرر  
 کیا گیا تھا وہ ایک شعر تھا:-



۵ ہوگی نجات اُس کی عمل جس کے نیک ہوں

کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دیندار ہو

کئے والا اس سلسلہ میں یہ استدلال پیش کر سکتا ہے کہ خدا جسے آپ کہتے ہیں وہ اگر ہماری آپ کی طرح نام و نمود کو پسند کرتا ہوتا یا جذبہ انتقام رکھتا ہوتا تو ضرورت تھی اپنے پر و پیگندے کے لئے اُس کو کہ دنیا مجھ کو جانے مجھے پہچانے تب میں اُس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کروں۔ جیسے ہم میں ایسے تنگ نظر لوگ ہیں کہ کوئی حسن سلوک کرتے ہیں تو وہ چاہتے ہیں کہ ہر جگہ اُس کا ڈھنڈھو را پیٹا جائے اور اُس کی انتہا ہو۔ اور اگر اتفاق سے ایسا موقع ہو کہ جس کے ساتھ ہم نے اچھائی کی ہے اُس نے اُس کا اظہار نہ کیا تو بس ہماری تیوریاں چڑھ گئیں اور ممکن ہے اب ہم اپنے طرز عمل میں اُس کے ساتھ تبدیلی کر دیں۔ خدا تو مستغنی ہے اُسے ان باتوں کی ضرورت نہیں۔ وہ اگر کوئی حکم دیگا تو وہ بھی ہماری اچھائی کے لئے دیگا۔ پھر ہم چونکہ مادی دنیا کے ہیں۔ یہاں رہنے سہنے اور بسنے والے ہیں اس لئے جو ہماری اچھائی برائی ہوگی وہ ہماری اسی مادی دنیا سے متعلق ہوگی اس کا تعلق ہمارے افعال سے تو بیشک ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ہمارا کوئی کام ایسا ہو جس سے ہم کو فائدہ پہونچے اور کوئی کام



ایسا ہو جس پر نقصان پہونچے۔ اس لئے بالکل ٹھیک ہے کہ ہماری افعال پر پابندی عائد کی جائے جس سے ہماری زندگی کی اصلاح ہو سکے لیکن اعتقاد اس کا کہ خدا ہے 'یا نہیں' اس سے ہماری زندگی کی کون سی اصلاح ہو سکتی ہے اور اس کے نہ ماننے سے ہمارے لئے کون سی خرابی ہو سکتی ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی نجات کا استحقاق ہے وہ عمل سے متعلق ہے۔ اعتقاد کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ ہے نقطہ خیال ان لوگوں کا جو میں نے پیش کیا۔

اس کے جواب میں میں وحشیوں سے گفتگو کر دیکھا۔ پہلے تو اس بنیاد پر کہ اعتقاد عمل سے غیر متعلق چیز ہے۔ لیکن خود اعتقاد کی کوئی ضرورت انسان کے لئے ہو سکتی ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ حسن عمل کا کوئی تعلق اعتقاد سے ہے یا نہیں یہ دو نقطے بحث کے ہیں جن میں اگر میں کامیاب ہوا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسانی بہبودی کے لئے اعتقاد کی بھی ضرورت ہے۔

انسان اگر اپنی حقیقت کے لحاظ سے صرف یہی ہوتا جو آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے یعنی رنگ، روپ، شکل، مقدار تو بس اسی حیثیت سے اس کی اچھائی ہو۔ اسی حیثیت سے اس کی برائی اور اس صورت میں یہ خیال بھی کسی حد تک صحیح ہو سکتا تھا کہ انسانی ترقی اور کمال میں



صرف افعال کو دخل ہے۔ لیکن اگر انسان اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے جو باطن سے متعلق ہے تو اس انسان کی اچھائی اور برائی صرف اُس کی جسمانی حیثیت سے وابستہ نہیں ہو سکتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو انسان کی ترقی و تنزل اچھائی اور برائی کو صرف اُس کی محسوس شکل و شمائل اور جسمانی حیثیت میں منحصر قرار دے۔

اس کی جسمانی حیثیت کیا ہے؟ مثلاً وزن۔ انسان کبھی موٹا ہو جاتا ہے اور کبھی دبلّا وہ اُس کی جسم کے اعتبار سے گرانقدری ہے اور یہ سبکی۔ انسان کوٹھے پر چڑھ گیا اور نیچے آ گیا۔ وہ اُس کی جسمانی بلندی ہے اور پستی۔ اُس کی صورت جاذب نظر اور شکل دلفریب ہو یا خط و خال قابل نفرت ہوں ایسے کہ دیکھ کر آنکھ بند کر لینے کو دل چاہے وہ اُس کی خوبی ہے اور یہ بدی۔ مگر کیا کسی ذبیحہ و طبقہ میں انسان کی گرانقدری اور سبکی۔ بلندی اور پستی۔ خوبی اور بدی کا یہ مفہوم قرار دیا جائے گا؟

اس وقت ”علم“ کی ہر طرف پکار ہے قوم کو ترقی کی ضرورت ہے۔۔۔ علم سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے کون سی ترقی حاصل ہوتی ہے؟ میں جسمانی حیثیت کے طلاب کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے



بستی ہی بستی نظر آتی ہے۔ باریک کتابیں پڑھتے پڑھتے آنکھیں کمزور  
 ہو جاتی ہیں۔ محنت کرتے کرتے چہرہ کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ دست  
 و پا خیف و لاغر ہو جاتے ہیں۔ بہت سے طالب علم ایسے ہیں کہ مشقت  
 اٹھانے سے بیمار پڑ جاتے ہیں اور بعض تودق میں مبتلا ہو کر دنیا ہی  
 سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگر اس لڑکے کو عیش و عشرت میں مشغول  
 چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً اُس کے جسم کی توانائی کا عالم ہی دوسرا ہوتا۔  
 لیکن علمی کدو کا دوش کی وجہ سے اُس کی طاقت بضمحل ہو گئی۔ اُس کا  
 وزن گھٹ گیا۔ پھر اُس نے ترقی کیا کی؟ آپ فرمائیے کہ نہیں؟ یہ  
 فلاں علم کے شعبہ میں بہت مشاق ہو گیا ہے۔ یونیورسٹی میں اُس کا  
 مثل نہیں ہے۔ اُس کو تنغے ملے ہیں۔ اور انعامات عطا ہوئے  
 ہیں۔ اُس نے بہت نمایاں ترقی حاصل کی ہے۔ میں کہوں گا  
 کہ آخر اُس میں کس چیز کی ترقی ہوئی۔ ہاتھ پیروں کی تو ترقی نہیں  
 ہوئی۔ آپ فرمائیے کہ نہیں اس کے دماغ کی ترقی ہوئی تو اس کا  
 کیا مطلب۔ دماغ کی بھی جسمانی حیثیت یعنی سر اُس کا چھوٹا تھا  
 اب بڑا ہو گیا۔ دماغ میں سورخ کم تھے اب زیادہ ہو گئے۔ مگر نہیں  
 یہ اور اکات کی ترقی ہے جسے آپ انسان کی ترقی سمجھتے ہیں۔ اور  
 کی ترقی خود ایک مستقل ترقی ہے جو انسان کے لئے بہت بیش قیمت چیز ہے



پھر اور اکات مختلف ہوتے ہیں۔ اُن میں درجے قائم ہیں۔ کوئی انسان کے لئے زیادہ بلند ہے اور کوئی کم۔ ایک بڑھئی کو اپنے شعبہ کے متعلق معلومات حاصل ہیں اور ایک لوہار کو اپنے شعبے کے متعلق۔ ایک سنار کو اپنے شعبہ میں۔ اور ایک تاریخ و ادب کے پروفیسر کو اپنے شعبہ میں یقیناً وہ معلومات جو بڑھئی لوہار یا سنار کو اپنے فن کے متعلق ہیں وہ ان پروفیسر صاحب کو حاصل نہیں ہیں جس طرح ان کے معلومات ان کے ساتھ مخصوص ہیں اور وہ دوسرے اُن سے جاہل ہیں اس لئے ان سب کو مساوی حیثیت حاصل ہونا چاہئے۔ مگر عقلائے زمانہ ان میں تفریق قائم کرتے ہیں۔ وہ لوہار سے سنار کے درجہ کو بلند قرار دیتے ہیں۔ اور ان تمام لوگوں سے پروفیسر صاحب کے مرتبہ کو بالا تر سمجھتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک کی بلندی اور اُس کے درجہ کی رفعت اپنے متعلق کے اعتبار سے ہے یعنی وہ شے جس کا ادراک ہو رہا ہے جتنی بلند ہوگی اتنی ہی بلندی اُس ادراک میں پیدا ہوگی اور اتنا کمال انسانی کا جو ہر اُس میں زیادہ مضمر ہوگا۔

سنار کا فن چونکہ سونے سے متعلق ہے اور لوہار کا کام لوہے سے اور خود سونا قدر قیمت میں لوہے سے زیادہ ہے اس لئے سناری کا



پیشہ بھی لوہار کے پیشہ سے رفیع المرتبت ہو گیا پھر چونکہ ایک پروفیسر  
کے معلومات کا تعلق بلند موضوعات سے ہے اس لئے اُس کا علم  
اُن سب سے بلند ہوا۔

اس اصول پر یقیناً اگر خدا کوئی چیز ہے تو اُس کی ہستی ہر موجود  
دکان سے بلند بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی ہم پلہ کوئی چیز نہیں  
ہی۔ اور اس لحاظ سے انسانی دماغ کی انتہائی کامیابی اور بلندی کی  
اُس کے متعلق معلومات کے ادراک حاصل کرنے میں جو خدا شناسی  
کی منزل ہے اور جسے "معرفت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اب اس  
میں آپ کو کسی مادی منفعت کی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے  
جسمانی فائدہ کی جستجو کا موقع ہے، بلکہ خود یہ علم و معرفت ہی ہزار  
فائدوں سے بڑھ کر ایک فائدہ ہے جو انسان کے لئے بلندی و رفعت  
کا سبب ہے۔

پھر نجات جو چیز کا نام ہے جس کا تذکرہ اس شعر میں کیا گیا ہے جو  
میں نے اس بحث کے شروع میں پیش کیا ہے

ہو گی نجات اُس کی عمل جس کے نیک ہوں

اس کا تعلق اگر صرف جسمانی بہبودی کے ساتھ ہو تو یہ سمجھنا ممکن بھی ہے  
کہ وہ صرف افعال پر موقوف ہے لیکن اُس عالم کے احکام کا تعلق



انسان کی صرف ظاہری حیثیت کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اُس باطنی حیثیت کے ساتھ ہے جس کو عقل و دماغ یا قوت ادراک کہتے ہیں۔ اسی لئے دیوانہ تکلیف سے مستثنیٰ کر دیا گیا حالانکہ ممکن ہے اُس کی جماعت طاقت صحیح انسانوں سے زیادہ ہو۔ اُس کے خط و خال بھی بہت اچھے ہوں مگر اُس میں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا نجات یا عدم نجات کا کیونکہ وہ اس میدان ہی میں نہیں ہے جس کے اندر یہ مقابلہ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نجات کا تعلق انسان کی ظاہری جسمانی حیثیت کے ساتھ نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے جو کہا گیا ہے کہ الاعمال بالنیات عمل تو کسی کام کی مادی حیثیت ہے۔ اور نیت اُس تعلق کا نام ہے جو انسانی دماغ کے ساتھ ہے۔ اگر عمل کی ظاہری صورت مکمل ہو مگر اُس کا تعلق انسان کے دل و دماغ کے ساتھ مکمل طور پر نہ ہو تو عمل کو فی چیز نہیں ہے۔ انسان کا تخیل و تصور بہت سی چیزوں میں واقعیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے ایک سینا راستہ جس پر غموتا لوگ تفریح کے لئے جایا کرتے ہیں۔ جیسے ٹھنڈی شرک۔ اس سے اُن کے مزاج میں انبساط پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہی راستہ اگر مشغولیت کے طور پر کسی فرض کی انجام دہی کے سلسلہ میں طے کیا جائے تو وہ فائدہ اُس سے نہیں مرتب ہوتا جو سیر و تفریح سے ہوگا۔ وقت ہی



تیسرے پہر کا۔ جگہ وہی ٹھنڈی شرک۔ مگر چونکہ احساس یہ ہے کہ میں کام کو جا رہا ہوں۔ تفریح کا تخیل دماغ میں نہیں اس لئے قوت کا اثر بھی مترتب نہیں ہے۔ یہی صورت سمجھ لیجئے نیت کی۔ وہ انشا بھی نماز کی۔ وہ دوز و صوب حج کی۔ اگر اس کا تخیل نہیں کہ ہم کس کے حکم کی انجام دہی میں مصروف ہیں تو اُس کا نتیجہ وہ نہیں ہو سکتا جو اس عبادت کا اصلی منشا ہے۔ یہ حیرت انگیز حقیقت دماغ سے متعلق ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے لحاظ سے عمل میں وزن پیدا ہوتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ہم سے جو کہا گیا کہ میزان اعمال نصب ہوگی۔ تو چونکہ ہم اس مادی فضا میں پرورش پائے ہوئے ہیں ہم نے سمجھ لیا کہ وہ اسی طرح کی کوئی بڑی ترازو ہوگی جس کے دو پلڑے ہونگے اُن کے درمیان لائن ہی ڈنڈی لگی ہوگی۔ کوئی زشتہ اُس کو کپڑے ہوئے ہوگا۔ اعمال ڈھوڈھو کر لائے جا رہے ہونگے اور تولے جائیں گے۔ یہ تصور ہمارے ذہن نے پیدا کیا ہے۔ حالانکہ میزان کے معنی ہیں جانچنے کا ذریعہ جس طرح کی چیز ہوتی ہے ویسی ہی اُس کی ترازو ہوتی ہے۔ کٹری کے لئے اُس طرح کی ترازو جو ٹھیکوں پر آپ نے دیکھی ہے۔ سونا تو نے کیلئے وہ کانٹا جو سناروں کے یہاں ہوتا ہے۔ شعر کے جانچنے کے لئے میزان ہے۔ وہ علم عروض جس سے



معلوم ہوتا ہے کہ کون شہر چل رہا ہے اور کون کم زیادہ۔ اور عقلی نتائج کے لئے وہ استدلال کے معیار جو علم منطق میں مذکور ہیں۔ اسی لئے منطق کا نام علم المیزان "قرار پایا۔ اس طرح اعمال کو سمجھ لیجئے۔ اگر وہ کوئی مادی جسم رکھتے ہوئے جیسے لوہا، سونا، چاندی وغیرہ تو اس کی میزان اس طرح کی ہوتی لیکن جبکہ ایسا نہیں ہے تو میزان عمل پس وہ معیار جس سے عمل کے ناقص اور کامل ہونے کا پتہ چل جائے۔

یہ صوفیوں کا قول تھا کہ یہ بلکہ کیفیت کا بھی قول تھا ہے۔ دنیا میں یہ جانچ نہیں ہو سکتی۔ یہاں عجیب ہیں۔ یہ عالم ظاہر ہے اور ظاہر ہی پر یہاں نتائج مرتب ہوتے ہیں لیکن وہاں انسانیت کی جانچ ہوتی ہے جو ان پردوں کے اندر مضمر ہے۔ انسانی معارف و ادراکات ہی وہ ہیں جو اس انسان کی بلندی کا ذریعہ ہیں۔ اور انہی سے نجات کا تعلق ہے۔ پھر یہ خیال کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ نجات میں عقیدہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اب دوسری حیثیت سے ملاحظہ فرمائیے کہ نجات اس کی ہوگی جس کے عمل نیک ہوں لیکن عمل کے نیک ہونے کا کیا معیار ہے؟ کھیسے ہم سمجھیں کہ یہ عمل نیک ہے اور یہ عمل بد ہے۔ اگر دنیا نیکی بدی کے حدود کے تعین میں کسی ایک نقطہ پر مجتمع ہو جاتی تو یہ سمجھنا آساں تھا کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ لیکن جس وقت میں ہم اہل علم کے طبائع، آراء و خیالات کا جائزہ



لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نیکی و بدی کے مسئلہ کو دنیا پورے طور پر طے  
 نہیں کر سکی ہے۔ آپ ممکن ہے میرے سامنے بعض باتیں پیش کر دیں  
 کہ یہ سب کے نزدیک اچھی ہیں مثلاً سچ بولنا۔ امانت داری سے کام لینا۔  
 لیکن اگر ذرا آپ میرے ساتھ چلیں تو میں آپ کو بعض ایسے چوراہوں  
 پر لے جا کر کھڑا کر دوں گا جہاں آپ حیران ہو گئے کہ نیکی کا راستہ کون سا ہے۔  
 سچ بولنا اچھا ہے مگر ایک شخص تلوار لے کر آتا ہے اور ایک  
 بے گناہ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بیچارہ نفی ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھ رہے  
 ہیں اور اس کے جائے پناہ سے واقف نہیں۔ ظالم آتا ہے اور دھڑ دھڑ  
 دیکھتا ہے۔ ہم سے پوچھتا ہے۔ تم نے فلاں شخص کو دیکھا ہے؟ تم کو  
 معلوم ہے وہ کہاں گیا ہے؟ اب فرمائیے سچ بولا جائے؟ یہاں پر  
 امانت کا نام مجھے معلوم ہے۔ وہ اس جگہ پر چھپا ہوا ہے۔ اگر آپ نے  
 کہہ دیا تو معلوم ہے کہ اس کی گردن ہوگی اور اس ظالم کی تلوار۔  
 یہ تک عقلائے عالم اس جگہ پر فیصلہ نہیں کر سکتے کہ سچ بولنا تحسن ہے۔  
 امانت کا واپس کرنا اس کے مالک کی طرت بہر حال تحسن ہے۔  
 اتفاق سے اسی ظالم نے اپنی تلوار آپ کے پاس امانت رکھ چھوڑی تھی  
 اس وقت وہ اپنی امانت کو مانگ رہا ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ اس  
 تلوار کو بیکر وہ اس مظلوم کو قتل ہی کرے گا۔ اس وقت ہرگز نہیں



کہا جاسکتا کہ اس امانت کا دنیا عقلاً مستحسن ہے۔  
دنیا کی کوئی چیز ایسی ہی جس میں کلیۃً عقلاً اے عالم کسی نقطہ پر مجتمع ہو گئے ہوں؟۔

آپ کہیں گے کہ دنیا میں اکثریت جس چیز کو صحیح سمجھ لے وہ صحیح ہے  
یہی ہوا ہے جو چلی ہوئی ہے۔ مگر کیا عالم میں جمہوریت کے لئے کوئی  
منضبط نظام ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی نقطہ پر برقرار رہے۔ ہم تو جس  
وقت دنیا میں شروع سے آخر تک عالم انسانیت کے معیار عمل کو دیکھتے  
ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثریت اور اقلیت ہوا کے جھونکوں کے  
ساتھ آتی جاتی رہی ہے۔ ایک وقت میں جس چیز پر جمہور مجتمع تھی  
دوسرے وقت اُس کے خلاف پر مجتمع ہو گئی۔ مثلاً ایک وقت دنیا  
شہنشاہیت کو پسند کرتی تھی۔ اس کے بعد ایک درایسا آج میں  
لوگ کہتے ہیں کہ جمہوریت اچھی ہے شہنشاہیت کو مٹا دینا چاہیے۔ مگر  
کیا دنیا اس بات پر برقرار رہی؟ ایسا نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ  
برابر انقلابات ہو رہے ہیں۔ وہی قدم جو آگے بڑھے تھے پیچھے ہٹا دیے  
گئے ہیں۔ وہ مقامات جہاں جمہوریت قائم ہو چکی تھی اب جمہوریت ٹوٹ کر  
پھر وہاں شخصی سلطنت قائم ہو رہی ہے جس طرح وہ خود مختار عکراں جو  
دنیا پر اپنے طاقت و اقتدار کا دباؤ ڈالتے ہیں غلہ میں رہتے ہیں



اسی طرح روس کو قائد اعظم کے خلاف بھی برابر سازشیں ہوتی رہتی ہیں اور دنیا اُس کی ہستی سے بھی اپنے ورق کو پاک کرنا چاہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی پیاس کسی طرح بجھتی نہیں کیبھی ایک مختتم نتیجہ پر پہونچ کر دنیا ٹھہر جائے کہ بس اب یہ نقطہ حقیقت ہے۔ ایسا کبھی نہیں بچوس وقت میں یہ اقلیت اور اکثریت تبدیل ہوتی رہتی ہے تو ہم اس کو معیار حقانیت کیسے قرار دے لیں کیونکہ حقیقت تو وہ چیز ہوتی ہے جو ناقابل تبدیل ہو۔

یہی اشتراکیت جو اس وقت ایک ہم گیر سوال کی صورت میں بن گئی ہے۔ اس کے متعلق عالم کے نقطہ نظر میں قدر انقلاب ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہر ایک کے دماغ میں سرمایہ داری کی ہوتی تھی ممال میں ملکیت و وراثت کا اصول کارفرما تھا۔ اب یہ دور آگیا ہے کہ دنیا والے کہنے لگے۔ نہیں یہ دنیا کی پیداوار کی ملکیت ہونا چاہئے۔ کسی ایک کا بھی کوئی خصوصی حق نہیں ہے۔ زمین مشترک۔ اُس کی پیداوار مشترک۔ اس لئے ہر ایک شخص بقدر ضرورت مستفیع ہو۔ پھر ان متضاد نظریوں میں صرف اقلیت و اکثریت کی بنا پر ہم یہ کیسے سمجھیں کہ کون سا نظریہ واقعا صحیح ہے۔

پھر یہ کہہ دیا جائے کہ جس کی جو سمجھ میں آئے اُس کے لئے وہ



نیکے۔ اس کے لئے کوئی عمومی معیار نہیں ہے۔ بیشک اگر افراد انسانی  
 لگے لگے زندگی گزار سکتے تو آپ کا یہ تصفیہ صلیح کل حیثیت رکھتا تھا  
 اور یہ مان لیا جاتا کہ جو شخص جو طریق کار بہتر سمجھو اس کے لئے وہی صحیح ہے۔  
 لیکن جبکہ یہ تمام افراد اپنی فطرت اور اس کے ضروریات کی بناء  
 پر اتحاد عمل کے محتاج ہیں اور متحدہ حیثیت سے زندگی گزارنے کی ضرورت  
 ہے تو آپ ان میں سے ہر فرد کو مطلق العنان کیسے بنا سکتے ہیں؟ اس  
 صورت میں بہت سے لوگ اپنی ذاتی خواہشوں کی بناء پر کچھ چیزوں  
 کو اختیار کریں گے اور جب آپ راضی کرینگے تو وہ کہہ دیں گے کہ جو  
 جس کا خیال ہے وہ اس کے لئے صحیح ہے۔ اس وقت میں یہ افراد  
 انسانی ایک مجموعی نظام میں منسلک ہی نہیں ہو سکتے۔ ہر فرد عالم  
 جدا ہوگی اور چونکہ انسان انفرادی حیثیت سے زندگی نہیں گزار سکتا اس  
 لئے دنیا فنا ہو جائیگی۔ تو پھر ضرورت کس بات کی ہے؟ ہم ان تمام مختلف  
 آراء و افکار میں خولہ فحولہ کہیں کہ تمہارا طریق کار صحیح ہے اور تمہارا غلط۔  
 اس کا ہمیں حق کیا ہے جبکہ ہم کو ان پر کوئی تفوق نہیں ہے۔ ہم بھی  
 ان ہی کی طرح انسان ہیں۔

کوئی صحیح طریق کار اس عالم انسانیت کو ایک راستہ پر متحدہ عمل  
 کرے پسے کلا قرار ہی نہیں دیا جاسکتا جبکہ ان سب ایک بات



طاقت کو فرض کرنے ہوئے اُس کے فیصلہ کو ان سب پر کارگذار نہ کر دیکئے اور سب کو اُس کا پابند بنائیے۔ اب ان سب کے ذاتی خیالات و آرا و افکار باہم دیگر کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں مگر جب یہ تمام آرا و خیالات اُس بالادست قوت کے سامنے آئیں جو ان سب پر ہے تو محو ہو جائیں۔

یہی قوت جو ایک بالادست ہستی کو سلسلے میں تمام انفرادی آراء کو تذکرہ دے اسی کا نام ہے ”مذہب“ اور اس کے احکام کے مجموعہ کا نام ہے ”شریعت“۔ اگر آپ نے شریعت خداوندی کو تسلیم کر لیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس دنیا میں ایک نظام اجتماعی مقرر کر سکتے ہیں کیونکہ اس قانون کا انتساب اُس ہستی کی طرف ہے جو سب سے مافوق ہے میں اگر اس مختلف افعال مجمع میں کہوں کہ آپ کی رائے غلط اور آپ کی رائے صحیح تو مجھے کہنے کا حق کیا بہت سے لوگ مقابلہ کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ایک ایسی ہستی مسلم ہو گئی جس کی نسبت ان تمام افراد کو بدگی کی حیثیت حاصل ہو تو اس کا نافذ کردہ قانون چاہے کسی کی طبیعت پر بار ہو۔ چاہے کسی کی عقل میں نہ آئے چاہے کوئی کہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر چونکہ نافذ کیا ہوا اُس کا ہے جو ہم پر حکمران ہونے کا استحقاق رکھتا ہے اس لئے اطاعت اس کی سب پر فرض ہے۔



ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت کی مجلس قانون ساز کے ارکان جو قانون بناتے ہیں اُس کے ہر ہر جزو کے رموز اور مصالح پر رعیت کے تمام افراد مطلع نہیں ہوتے اور نہ اُس کے ہر جزو سے متعلق ہوتے ہیں بلکہ بہت سے اُن میں سے ایسے ہوتے ہیں جو اُس کی مصلحت کو نہیں سمجھ سکتے اور اگر ان قوانین کے ہر جزو کو ہر شخص بتا سکتا تو یہ ملت ہی بڑے ماہر قانون قرار پاتے جتنے کہ مجلس مقننہ کے ارکان ہیں۔ لیکن جب تسلیم ہے کہ اُن کا قانونی دماغ ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے تو ہمارے لئے یہ یقینی طور پر کہا بھی نہیں جاسکتا کہ ہم ان کے بنائے ہوئے قانون کے تمام پہلوؤں کو اپنی عقل سے سمجھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی اُس قانون پر عمل کرنا سب پر لازم ہے۔ اس لئے کہ مصلحت فہمی دوسری چیز ہے اور اطاعت دوسری چیز۔ ہم نہ سمجھیں اُن کے قانون کی مصلحت کو لیکن چونکہ ہم اُن کی حکومت کے اندر داخل ہیں اس لئے ہم کو اُس قانون پر بہر حال عمل کرنا ہوگا۔ پھر یہ تو ایک عارضی اقتدار ہے جو بالکل ظاہری حیثیت رکھتا ہے اور محدود بھی ہے۔ اس کو خالق کی عظمت کی کیا نسبت۔ اب اگر اس تمام عالم انسانیت کے لئے ایک خالق کا وجود مان لیا گیا جس کی دانائی و حکمت بھی اُس کے کمال ذاتی میں مضمر ہے تو اُس کے نافذ قانون کے متعلق ہمیں یہ تو کبھی توقع ہی نہیں کرنا چاہئے کہ ہم اُس کے تمام مصالح درموز کو سمجھ سکیں گے جبکہ ہمارا جہل تسلیم شدہ ہے اور اُس کا



ہماری احتیاج تسلیم شدہ اور اُس کا استغناء۔ پھر ہم کو یہ حق کہاں سے پہونچ  
سکتا ہے کہ یہ حکم کیوں؟ اور وہ حکم کیوں؟ ہم کو تو اُس حکم کو ماننا ہے اس لئے  
کہ اُس کا حکم ہے۔ مصلحتیں اس میں ہوں گی اور ممکن ہے ہزاروں ہوں لیکن  
ہم ان مصلحتوں کو سمجھ لیں۔ کیس طرح ضروری قرار پا سکتا ہے؟

اب آپس میں ذاتی آراء و خیالات میں لاکھوں بھی اختلافات ہوں مگر  
راہ عمل میں سب متحد و یکساں ہونگے۔ اس لئے کہ ان کا محرک صرف ایک ہے۔  
اور وہ اُس مالک کی عبودیت جو ان سب کے ساتھ مشترک اور یکساں تعلق  
رکھتا ہے۔

آئیے تمام عالم کو ہم اسی کی تعین کرتے ہیں کہ نجات اُس کی ہوگی جس کے  
عمل نیک ہوں۔

لیکن تمام عالم کے لئے مشترک نیک عمل کے حدود متعین ہی نہیں  
ہوتے جب تک ایک متحد نظام کے تحت ہیں اُس کو نہ لائیں اور وہ بغیر  
اعتقاد کے ممکن نہیں۔

آپ فرمائیے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں قوانین بنتے ہیں اور ان پر کامیاب  
کے ساتھ عمل بھی ہوتا ہے حالانکہ وہاں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہے۔

میں افسوس کے ساتھ کہوں گا کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ آؤں تو جہاں  
تک دیکھا جاتا ہے سلطنتی قوانین نے خود مذہبی شریعتوں کے اصول سے



مرد حاصل کی ہے لیکن اس کو جانے دیجئے۔ مخالفت اس کو تسلیم نہیں کریگا۔  
یہ ملاحظہ کیجئے کہ سلطنتی قوانین کی بنیاد ظاہری طاقت و جبروت پر ہے  
اس لئے وہ صرف مادی زور و اقتدار کے سہارے پر دنیا میں چلتے ہیں یعنی  
خود انسانی ضمیر ان کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ادھر زراقتدار کی  
گرفت ڈھیلی ہوئی اور سلطنت کی بنیاد میں تزلزل پیدا ہوا اور دنیا نے  
اُس جوئے کو آنا بھینکنے کی کوشش کی جو زبردستی اُس کی گردن پر رکھ دیا گیا  
ہے۔ بعد اگر سلطنت کی طاقت مستحکم ہے جب بھی اتفاق سے ایسی صورتیں پیدا  
ہو جائیں کہ مادی ذرائع انسان کو سزا بربانے سے قاصر ہوں جس طرح ایسا  
موقع جب کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ جاسوس و خبر کا اندیشہ نہ ہو تو ایسے وقت میں  
کوئی چیز نہیں ہے جو انسان کو احترام قانون پر مجبور کرے لیکن مذہبی قانون،  
وہ خود انسان کے نفس میں انسان پر نگراں مقرر کرتا ہے یعنی ضمیر انسانی  
خود اُس کے عمل کا محاسب بن جاتا ہے۔ اس لئے چاہے کوئی خبر رساں نہ  
ہو جو ہو لیکن ضمیر کی طاقت خود انسان کو احترام قانون پر مجبور کرتی ہے  
اور یہ اُسی دوسرے جزو نتیجہ ہے جس کا نام ہے "اقتدار"۔

اس کا نتیجہ ہے کہ مذہبی جذبہ کبھی دنیوی اقتدار سے دبتا نہیں بھیجی  
اس قسم کی مثالیں یہاں پر پیش کرنا نہیں ہیں۔ تاریخ کے اوراق سے پونچھ  
لیجئے۔ دنیاوی اختیارات نے مذہب کی مخالفت میں کیسے کیسے تشدد کی



کام لیا۔ اگر مذہبی احساس بھی کسی مادی جذبہ پر مبنی ہوتا تو مذہب کب کا فنا ہو گیا ہوتا۔ مگر چونکہ ایسا نہ تھا اس لئے اگر سلطنت کے اقتدار سے مذہب کو بچا بھی جائے تو وہ برباد ہو گا جیسے راکھ کے پردہ میں چھپی ہوئی چنگاری۔ اور یہ پردے ہٹے اور اُدھر چنگاری نمایاں ہوئی۔ اس لئے دنیاوی اقتدار و شکست کھاتا رہا مذہبی جذبہ کے مقابلہ میں۔ کہو نہ کہ وہ مبنی تھا ظاہری اسباب پر اور وہ میں عارضی اور یہ مبنی ہے قلبی احساس پر جو مستقل اور دیر پا حیثیت رکھتا ہے۔ بیشک دنیا کی سلطنتیں مائتہ پیروں پر حکومت قائم کر سکتی ہیں لیکن دلوں پر حکومت نہیں کر سکتیں اور دنیا جو حکومت کرتا ہے وہ مذہب ہی ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر دنیا کو حقیقی معنوں میں نیک عمل کا یا بند بنانا ہے تو ایسے مذہب ہی کو تلاش کیجئے جو نیک عمل کی طرف دعوت دیتا ہو۔ وہ اعتقادات ہی اس انسان کے عملی استحکام کے ضامن ہونگے۔ لیکن اگر عمل کو اعتقاد سے الگ کر لیجئے گا تو ان کی عمارت بالو کی زمین پر بلند ہوگی جس کا ذرا سے میں ٹھیکہ جانا لازمی ہے۔

نجات کا اگر نیک عمل ہی سے تعلق ہے تو بھی اُس حسن عمل کا ذریعہ صرف اعتقاد ہے۔

بیشک اس امر کے دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ اعتقادات کن کن سے



نقطہ حقیقت کے مطابق ہیں۔ کیونکہ دنیا میں تخیلات کی کثرت ہے۔ حق و باطل میں آمیزش ہے اور اس لئے مذاہب کی تعداد میں کثرت پیدا ہوئی ہے۔ مذہب کے خلاف ایک یہ چیز بھی ہے جو بطور اعتراض پیش کی جاتی ہے کہ جناب! اگر مذہب ایک ہوتا تو خیر آسانی کے ساتھ مان بھی لیتے مگر مذہب تو دنیا میں بہت ہو گئے ہیں۔ اب کس کو مانا جائے اور کس کو نہ مانا جائے۔ اس لئے ہماری نجات اسی میں ہے کہ اب ان سب کو خیر باد کہیں اور اس جھگڑے ہی میں نہ پڑیں۔ مگر یہ انسان کی دماغی کاہلی ہے اس کو حقیقت طلبی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ آپ کو اگر کسی جگہ جانا ہو اور راستہ میں چور اہل جاٹ لے لو کیا اس جگہ سے پلٹ آنا چاہئے کہ معلوم نہیں ہمارا راستہ کون ہے؟ نہیں بلکہ تحقیق کرنا چاہئے۔ پوچھنا چاہئے۔ قرآن سے مدد حاصل کرنا چاہئے اور اس طرف چلنا چاہئے جہاں اطمینان ہو جائے کہ یہ وہ راستہ ہے جو ہماری منزل تک پہنچا دے گا۔ دنیا کی کون چیز ایسی ہے جس میں سب ایک نقطہ مجتمع ہوں۔ کھانا کوئی کچھ کھاتا ہے کوئی کچھ تو پھر کھانے سے باز آئے کہ بون اس جھگڑے میں پڑے۔ اسی طرح لباس۔ طرز سکونت وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح اگر دنیا میں اختلافات نے مذہب کے راستے کو جدا جدا بنا دیا ہے تو آپ سوچیں سمجھیں عقل و فکر سے کام لیجئے اور اسے اختیار نہیجئے جو آپ کی سمجھ میں آئے



کہ حقیقی مذہب ہے۔ جو انسانی ترقی و مہبودی کا علمدار ہے۔ یہ نہ ہو کہ غور و فکر کی محنت سے بچنے کے لئے اپنے تئیں اس راستے سے خود دور رکھیں جو نقطہ حقیقت تک لے جاتا ہے۔

انسان کو قتل و دمار کی طاقتیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ وہ سوچنے اور سمجھنے۔ اگر مستفاد راستے سامنے نہ ہوتے تو پھر دماغ کو کاوش فکری سے دوچار ہی کہاں ہونا پڑتا۔

یہ خدا کی معرفت یعنی اس خالق کل کو پہچانتا جس کی طرف اہل مذہب دعوت دیتے ہیں خود انسانیت کو ایک نقطہ واحد پر لانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ دنیا میں محض یہی آس کو افراتفرات لگا کوئی ایک ملک باشندہ کوئی دوسرے کا کوئی سر کاہن ہے والا۔ کوئی مغرب۔ کوئی کالا کوئی گہا کوئی ایک خاندان کا کوئی دوسرے خاندان کا۔ کوئی مالدار۔ کوئی فقیر۔ کوئی توانا۔ کوئی ناتوان۔ یہ سب افراتفرات ہیں۔ ان کی ذمہ داری دنیا بھر میں تقسیم ہوئی۔ ہر ایک سرے کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ ہر ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی اجنبیت کا اظہار کرنے لگا۔ ان میں کسی مشترک نقطہ کا احساس نہیں ہے لیکن یہ خدا کا مان لینا کہ حقیقتاً ایک خالق ہے جس کے سب بندے ہیں ایک واحد چیز ہے جو اس تمام عالم انسانیت کو ایک نظام میں منسلک کر دیتی ہے۔ یعنی تمام افراد عالم میں ایک رشتہ داری پیدا کر دیتی ہے۔ رشتہ داری کے کیا معنی ہیں؟ صرف کسی ایک شخص کی طرف چند آدمیوں کا



مشترک انتساب، اسی کو قرابت کہتے ہیں جس کی وجہ سے یگانگی پیدا ہوتی ہو  
 اگر تمام دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیابی ہو گئی کہ ہم سب ایک خدا  
 کے بندے ہیں اور ہم سب کا خالق ایک ہی تو پھر دنیا میں ہزاروں افتراق  
 سو گریہ ایک رشتہ اُن سب پر حاوی ہے۔ اس احساس کا نتیجہ  
 کیا ہے؟ اس سے تبادلہ حقوق اور مساوات باہمی کا خیال پیدا ہوتا  
 ہے جس طرح ایک باپ کی اولاد۔ ایک ماں کے بچے۔ ایک خاندان  
 کے افراد۔ ایک ملک کے باشندے۔ ادھر ایک کا لفظ آیا اور برابری  
 کا خیال پیدا ہوا۔ اور اسی پر مساوات اور تبادلہ حقوق کی بنیاد قائم ہو۔  
 یہ دنیا دلے کیوں ایک دوسرے کو ذلیل نگاہوں سے دیکھتے  
 ہیں؟ یہ کیوں گورے کا لونکو اپنے ساتھ ہوٹل میں کھانا نہیں کھانے  
 دیتے۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ان کو یہ احساس نہیں ہے کہ جو اُن کا  
 خالق ہے وہی ہمارا بھی خالق ہے۔ اگر یہ احساس پیدا ہو جائے تو  
 وہ سمجھیں گے کہ یہ تو رنگ ساز کا کام تھا جو رنگ بدل دیا۔ اس سے  
 وہ ذلت کا سخن تھوڑی ہو گیا۔

پھر چونکہ دنیا میں افتراق قائم ہے۔ کوئی قوی ہے کوئی کمزور۔  
 اس قوت اور ضعف کی بھی عشتیں مختلف ہوتی ہیں جسمانی توانائی کے لحاظ  
 سے۔ مال و دولت کے لحاظ سے۔ عقل و تدبیر اور حلیہ گیری و سیاست کے



کاٹ سے اور یہ تمام مختلف اشخاص ضروریات دنیا کی احتیاج میں مشترک  
 ہیں۔ وہ جو ہمارے نزدیک غنی ہیں وہ سب سے زیادہ محتاج ہیں کیونکہ  
 احتیاج کے معنی ہیں ضرورت مند ہونا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک بادشاہ  
 کو اپنی سلطنت کے سنبھالنے میں جتنی چیزوں کی ضرورت ہے اتنی ایک فقیر  
 کو ضرورت نہیں ہے۔ اب ان تمام ضرورت مند اشخاص میں ہر ایک پر یہ  
 چاہتا ہے کہ ہم اپنے ضروریات زیادہ سے زیادہ حاصل کر لیں۔ دوسروں  
 کو اپنے مقابلہ میں ناقابلِ کاٹ سمجھتے ہیں اس لئے ان کے حقوق غصب  
 کرنا چاہتے ہیں۔ اور جس طرح کے جذبات ان کے دلوں میں موجود ہیں اسی  
 طرح کے نظریے بھی بناتے ہیں۔ یہ چیز طاقتور کمزور کو فنا کر دے۔ دنیا  
 میں نظریہ کی شکل میں آگئی ان الفاظ میں ”تنازع البقاء کی ضرورت  
 ہے“۔ یہ خیال مادی اصول سے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن اس مقابلہ  
 میں کہ ہر طاقتور انسان کمزور کو فنا کر دینا چاہے کیا یہ دنیا آباد رہے گی؟  
 غیر ممکن ہے۔ کیونکہ طاقت اور کمزوری اگر ایک مستقل اور پائیدار چیز ہوتی  
 تو پھر بھی ہم مان لیتے کہ ایک دفعہ جنگ ہو کر جو طاقتور ہو وہ ہمیشہ کے لئے  
 رہ جائے اور جو کمزور ہو وہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے۔ مگر یہ طاقت اور  
 کمزوری تو ادلتی بدلتی رہتی ہے ایک وقت میں جو طاقتور ہے دوسرے  
 وقت میں وہی کمزور ہوتا ہے اور جو کمزور ہے اس کو طاقت حاصل ہوتی



مثال کے طور پر ماما میں نے کہ آج یہ جوان ہے اور وہ کمزور ہے۔ یہ تاقی اُس کو مارے گا اور وہ برداشت کر لے گا۔ اس لئے کہ یہ طاقتور ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں بے بس۔ مگر ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ جوان بوڑھا ہو گا اور وہ بچہ جواں۔ اُس وقت معاملہ عکس ہو گا۔ طاقت کمزوری سے بدلی ہوئی ہوگی اور کمزوری طاقت کا لباس پہنے ہوئے ہوگی۔ یہ ایک وقت میں جس نے شکست کھائی اُس کے دل میں جذبہ انتقام ہے وہ وقت کا منظر ہے کہ جب موقع ملے تو اس کا بدلہ لوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تضاد کا ایک لائقناہی سلسلہ قائم ہو۔ یہ دنیا کیا ہوئی؟ خو خوار درندوں کا مجمع جس میں ہر ایک دوسرے کو دیکھ کر غرار ہا ہا سنہ کھولتا ہے اور دانت باہر نکالتا ہے اور موقع پاتے ہی جھپٹ پڑتا ہے کیا دنیا کی آبادی کی یہی صورت ہے؟ کیا اس طرح عالم کا نظام درست ہو جائیگا؟ پھر کیا ہو؟ یہ تضاد اگر درست ہو سکتا ہے تو اُس کے ماننے سے جس کا نام ہے خدا کیونکہ اب ایک طاقتور انسان اپنے دست بازو کو دیکھتا ہے۔ اپنے اقتدار کو دیکھتا ہے اور اپنی طاقت کو دیکھتا ہے۔ ان سب کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کا زور شخص کو فدا کر دوں گا۔ لیکن اسے اس کے ساتھ یہ بھی احساس ہے کہ اگر میں اس کو اس وقت ختم کر دوں تو مجھ سے ایک بالائست طاقت موجود ہے۔ یہ وہی



فنا کر سکتی ہے۔

دیکھئے دنیا میں دو چیزیں ہیں جو قوتِ عمل کو فنا کرتی ہیں۔ ایک انتہائی اطمینان۔ دوسرے انتہائی مایوسی۔ دنیا میں صرف مادی غلبہ و اقتدار کے معاملے سے دیکھئے تو ایک طاقتور انسان پورا اطمینان رکھتا ہے اپنی کامیابی کا اس لئے اُسے احساسِ فراغت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اور ایک کمزور انتہائی مایوسی اور ناامیدی رکھتا ہے اس لئے کہ اپنے ماحول کو دیکھتا ہے تو کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ اس انتہائی مایوسی کا نتیجہ یہ کہ وہ اُس طاقتور کے مقابلہ میں بالکل سہرا انداختہ ہو جاتا اور اپنی ہستی کو خود سہرہ و فنا کر دے۔ لیکن خدا کے وجود کا اعتقاد یہ وہ ہے کہ جو اُس کے کامل اطمینان میں ایک نوجوان اندیشہ کا پیدا کرتا ہے اور اس کی کامل مایوسی میں ایک لہر امید کی پیدا کرتا ہے۔

اُس کا یہ اعتقاد جسے چاہے خوفِ خدا کہ لیجئے اور چاہے اندیشہ سزا سے تعبیر کیجئے۔ اُس کے غرورِ تفوق میں ایک پہلو اعتدال کا پیدا کرے گا جس کی بنا پر اسے یہ خیال پیدا ہو گا کہ اگر میں ایسا کروں تو خدا کو برا نہیں معلوم ہو گا یہ سوچ کر اُس کا ہاتھ دے گا۔ اور اُس کا یہ اعتقاد جسے خدا پر توکل سے تعبیر کیجئے اس کے دل کو اُس کے مقابلہ میں قوی رکھے گا اور اس لئے یہ جلدی سے بے دست و پا اور سہرا انداختہ نہیں



ہو جائیگا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس وقت کمزور سی لیکن اس سے  
بالا تر ایک قوت موجود ہے

”دشمن اگر قوی است تمہاں قوی تر است“

اُس کی قوت و قدرت بہت بڑی ہے اور وہ بھی فتح دینے پر  
قادر ہے۔ یہ خیال اُسے سہارا دیتا ہے اور وہ قوتِ عمل کے صرف کرنے  
پر آمادہ ہوتا ہے۔ وہ دل کی قوت اُس کے بازوؤں کو زور و طاقت  
سے بھر دیتی ہے اور وہ اپنے اُنہی کمزور بازوؤں سے کچھ کر لیتا ہے  
جو ایک کمزور دل والا انسان اپنے قوی بازوؤں سے نہیں کر سکتا۔  
اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا ماننا وہ چیز ہے جو دنیا کی غیر متوازن قوتوں  
میں توازن پیدا کرتا ہے۔ عالم کی غیر متساوی قوتوں کو ایک طرح کی  
ساوات کی سطح پر لاتا ہے۔ احساسِ عمل کو بیدار کرتا ہے اور قوت  
مدافعت کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس کے ساتھ زبردستی کے دل میں  
رحم و کرم کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اور انصاف کے سامنے اُس کی گردن  
کو خم کر دیتا ہے۔

میں نے ابھی آپ کے سامنے اس صورت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ہاتھ  
میں تلوار۔ بازوؤں میں طاقت۔ سامنے مظلوم کا گلا۔ اور اُس کے قتل کے  
صلہ میں پیشمارِ دولت کے حصول کی امید۔ سب محرکات قتل موجود ہیں۔



تلوار لگا باڑھکتی ہے کہ گلا کاٹ دو۔ بازوؤں کی سکت کھیتی ہو کہ قتل کر ڈالو۔  
مظلوم کا گلا دھمت دے رہا ہے کہ میری باریک گیند قطع کر دو۔ نتیجہ کا خوشگوار  
تخیل بکا رہا ہے کہ اسے قتل کر کے اُس دولت کو حاصل کر لو۔ مگر دل کے  
اند سے کوئی صدا دیتا ہے۔ خبردار! اگر تلوار چلی تو یہ سمجھ لو کہ خدا کا بھی سنا  
کرنا ہے۔ وہاں کے لئے بھی کوئی جواب ہے؟ یہ جذبہ اُسی خدا شناسی کا نتیجہ  
ہے جو دل کی گہرائیوں سے انسان کے افعال کا احتساب کرتی ہے۔

افراد انسانی میں باہم ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ ہو ہی نہیں سکتا  
جب تک کہ خدا کے وجود کا اقرار نہ ہو۔ کیونکہ وہ جسے کہتے ہیں ”حق الناس“  
اس کا عائد کرنے والا کون ہوگا۔ یعنی مجھ پر آپ کا حق اور آپ پر میرا حق عائد  
کون کیلجبت تک کوئی ایک مشترک قوت ہم سب پر کار فرمائی نہ جائے۔  
مادی نقطہ نظر سے اور انکار خدا کے نظریے کے لحاظ سے میں سچ کہتا  
ہوں کہ اگر کوئی شخص مانت و دیانت، عدالت و انصاف وغیرہ کے  
نام بیٹھا ہے تو یاد رکھئے کہ یہ سنی سنائی باتیں ہیں۔ اہل مذہب کی زبان  
پر آنے والے ان الفاظ ہیں جو ان لوگوں کو بھی پیسے سے یاد نہ ہو گئے ہیں۔  
ورنہ حق شناسی کا مادی نقطہ نظر سے کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔

”عدالت“ کئے کیا معنی ہیں تقسیم حقوق کس لئے ہو جبکہ جو کچھ ہے وہ دنیا  
کی طاقت اور دنیا کی طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ وہ کمزور انسان جس میں



قوت مدافعت نہیں ہے اسے ہمارے مقابلہ میں فنا ہو ہی جانا چاہئے اور وہ اسی کا مستحق ہے۔ ہمیں کیا ضرورت کہ ہم اُس کی کوئی رعایت کریں اس لئے کہ ہم ہیں اور ہماری یہ زندگی ہو اور ہم کو اسی میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ آج ہم اس کمزور کے مقابلہ میں اپنا ہاتھ روکیں تو کس کے سہارے پڑاؤ کس امید پر۔ آخر کس دن کے لئے جبکہ اس کے بعد کوئی دن بھی نہیں نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ جو کچھ مل سکے ہم لے لیں۔ چاہے دوسرا مرے یا زندہ رہے۔

یہ سب باتیں کہ دوسرے کے حقوق کا خیال ہو۔ اُس کے ساتھ مساوات صرف کی جائے۔ ظلم و تعدی سے ہاتھ کو روکا جائے۔ یہ سب ایک خدا کے ملنے کے نتائج ہیں۔ ممکن ہے ظاہری طور پر خدا کی اقرار کرنے والی جماعت بھی غلطی طور پر اس کی پابندی نہ ہو لیکن نہ اُس کا نتیجہ ہو گا کہ حقیقی حیثیت سے اُس کے دل میں وہ اعتقاد جاگزیں نہیں ہو لیکن کم از کم لفظی حیثیت سے یہ تمام باتیں اہل مذہب کی شائع کی ہوئی ہیں اور ان ہی کا دیا ہوا سبق ہے جو عالم انسانی میں عموماً پڑھا جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ مادی دنیا والوں کی زبان پر بھی وہ الفاظ آ ہی جاتے ہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کی زبان سے وہ شرمندہ معنی بالکل نہ ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ دنیا کی آبادی۔ دنیا کی نجات۔ دنیا کا انتظام۔ دنیا کا



تمدن۔ ان سب کا سنگ بنیاد ہے۔ خدا کا احساس میں کا نام ہے "خدا کی  
 معرفت" یہ احساس جتنا زیادہ پیدا ہوگا اتنا ہی افعال میں توازن پیدا  
 ہوگا۔ اس لئے کہ انسان کے اعضاء و جوارح مختلف قوتوں کے زیر اثر  
 کام کرتے ہیں اور یہ تمام مختلف قوتیں جا کر سمجھاتی ہیں انسان کے نفس ناطقہ  
 میں جسم انسانی میں ہاتھ پاؤں آنکھیں وغیرہ الگ الگ ہیں اور ان میں  
 ودیعت شدہ طاقتیں جدا جدا ہیں اور ان کے کام علحدہ علحدہ ہیں مگر  
 یہ مختلف قوتیں سب جا کر ایک ہو جاتی ہیں اسی "نفس ناطقہ میں وکیل  
 ہونا جسے میں نے سمونے کی لفظ سے تعبیر کر لیا ہے۔ اسی لئے حکماء نے کہا ہے  
 النفس فی وحدتھا کل القوی۔ نفس انسانی اپنی یکتائی کے ساتھ  
 تمام قوتوں کا مجموعہ ہے" اسی وحدت کی شیرازہ بندی ہے کہ اس کثرت  
 کا انتظام درست رہتا ہے۔ جوارح و اعضاء کے افعال میں تضاد نہیں  
 ہوتا۔ بلکہ وہ سب ایک نظام کے اوپر کار فرما ہیں۔ اس لئے کہ اصل  
 میں ان سب کی کار گزار ایک واحد طاقت ہے۔ معرفت خدا کا احساس  
 براہ راست اس چیز کو متاثر جاتا ہے جو ان افعال کا سرچشمہ ہے۔ یہی  
 فرق ہے اعتقاد و اعمال میں۔ عمل انسانی اعضاء و جوارح کے اعتبار  
 سے جزئی حیثیت رکھتا ہے اور اعتقاد کل حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے  
 اعضاء و جوارح کے افعال میں تلازم نہیں ہے کہ اگر ہاتھ نیک کام کرتے



تو پاؤں بھی نیک کام کریں۔ زبان بھی نیک کام کرے۔ مٹن ہے کہ پاؤں کسی صبح راستے پر جا رہا ہو اور اُس وقت نگاہ غلط راستہ پر ہو۔ اسی طرح تمام اعضاء و جوارح۔ بوقت واحد ان کے افعال میں حسن و قبح کی حیثیت سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر یہ اختلاف ان میں کب تک ہے؟ جب تک یہ تمام افعال کسی خاص نفسانی احساس اور جذبہ کے ماتحت نہیں ہیں۔ لیکن اگر کسی چیز نے نفس کو متاثر کر دیا ہے تو آپ کے افعال میں یک رنگی پیدا ہونا ضروری ہے۔ اب اس جذبہ کا اثر پیروں پر بھی پڑے گا۔ آنکھوں پر بھی پڑے گا۔ ہاتھوں پر بھی پڑے گا۔ جتنی قوتیں اور جتنے اعضاء و جوارح انسان کے ہیں سب اُس سے متاثر ہوں گے۔

عمل کی قوت کو اگر آپ دیکھئے تو ملاحظہ کیجئے۔ عمل کی قوت کا ہے سے بڑھتی ہے؟ مشق سے براہ راست عمل کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر آپ اچھے اچھے کاموں کی عادت ڈالنا شروع کریں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آپ قوت عمل کو بڑھا رہے ہیں۔ مگر یہ قوت عمل کا بڑھانا محدود اثر رکھتا ہے۔ یعنی جس شعبہ میں جس چیز کی قوت آپ بڑھا رہے ہیں اسی میں اضافہ ہوگا۔ مثلاً آپ نے کسی بچہ کی زبان کو پیچ بولنے کی عادت ڈال دی وہ اب بیشک پیچ ہی بولے گا۔ مگر یہ کہ وہ کوئی شرارت جو ہاتھ سے متعلق ہے اُسے بھی نہ کرے۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی کے پیروں کو مسجد



ہر جانک عادت نہیں ہے وہ ضرور جاننا کیونکہ عادت خود محرک ان چیزوں میں سے ہے جس کا اثر حصول ہوگا  
 یہی شعبہ ہے جس کی عادت ہوگئی ہو۔ بہا متفک کہ اگر کسی داعط کا بیان ہوا  
 مجلس وعظ منعقد ہو تو وہ عادت ہرگز اس موقع میں شرکت کی محرک  
 نہ ہوگی۔ یہ کیا بات ہے؟ وہی کہ جو اصلاح کر رہے ہیں وہ براہ راست  
 عمل سے متعلق ہے اس لئے جس شعبہ میں عمل کا موقع ملے وہیں اس کا  
 اثر ظاہر ہوگا۔ لیکن اگر آپ کی اصلاح کا تعلق اس کے نفس کے ساتھ  
 یعنی اپنے اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا کر دیا ہے جو اس قسم کی تمام  
 باتوں کا محرک ہو کر رہا ہے تو اب آپ کو ایک ایک کر کے ان تمام باتوں  
 کی عادت دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس وہی ایک جذبہ جسے اپنے  
 کسی ذریعہ سے اس کے دماغ میں راسخ کر دیا ہے وہی ان تمام افعال کا  
 محرک ہوگا جو اس جذبہ کے ماتحت ہیں۔ خواہ وہ افعال ہاتھ سے متعلق  
 یا پانوں سے یا کسی اور چیز سے۔

عمل کا اثر محدود ہوتا ہے۔ مگر اعتقاد تصور و تخیل جو نفس کو براہ راست  
 متاثر کرتے ہیں ان کا اثر بچود و ہوتا ہے۔ یہ اعتقاد کے ضروری ہونے کا  
 خاص فلسفہ ہے۔ اعتقاد جا کر نفس انسانی کو پابند بناتا ہے اور جب  
 نفس پابند ہو گیا تو اب ایک ایک بات میں زحمت و مشقت کی ضرورت  
 نہیں ہے۔ بلکہ اعتقاد نفسی خود افعال کا محرک ہوگا۔ اس وقت سوچنے  
 کی ضرورت نہ ہوگی کہ پیروں کا کام ہاتھوں کا کام ہے یا آنکھوں کا کام ہے



کتاب کام تو نفس کا ہے اور نفس اپنے ذاتی احساس سے ان تمام افعال کا محرک ہے۔

یہ احساس جتنا قوی ہوگا اتنا ہی افعال میں اُس کا اثر نمایاں ہوگا ایک درجہ ہے اُس کا عدالت جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر گناہوں کا ارتکاب نہ کرے۔ اور اسی کا قوی درجہ ہے عصمت جس کے معنی یہ ہیں کہ اعتقاد اور احساس فرائض نفس میں اتنا راسخ ہو گیا ہے کہ کسی وقت نظر انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بھولے چوکے بھی گناہ نہ ہو جس طرح اگر آپ کوئی کتاب یاد کیجئے۔ اگر آپ میں حفظ کی طاقت کم ہے تو غلطیاں بہت ہوں گی۔ اور جتنا اُس طاقت میں اضافہ ہوگا اتنا غلطیوں کا وقوع کم ہوگا۔ ممکن ہے ایک درجہ ایسا آئے کہ اب کھلی ہوئی فاس غلطی کوئی نہ ہوتی ہو لیکن چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہو جاتی ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی پورے طور پر توجہ قائم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور توجہ ہٹنے کی صورت میں غلطی ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ حفظ بالکل ملکہ کی صورت سے ذہن میں راسخ ہو گیا تو پھر کسی طرح کی غلطی نہ ہو سکے گی۔ یہاں تک کہ اب بھول چوک کی غلطی کا بھی سبب ہو جائیگا۔

بس اسی طرح گناہوں سے حفاظت کو سمجھ لیجئے۔ احساس فرائض کا



ایک درجہ وہ ہے کہ انسان بڑے جرائم کا بالکل از نکاب نہیں کرتا مگر معمولی قسم کے گناہ اُس سے ہو جاتے ہیں پھر بھی اُن پر اصرار سے کام نہیں لیتا لیکن اس سے زیادہ مکمل درجہ وہ ہے کہ اب انسان کسی طرح کا گناہ نہیں کرتا اور اس سلسلہ میں کبھی بھون بھی اُس کو نہیں ہوتی اسی کا نام ہے ”محمت“ یہ بجائے خود ہر زمانہ میں ممکن الوقوع ہے یہ اور بات ہے کہ ثبوت اُس کا سوائے مخصوص افراد کے دوسروں کے لئے نہ ہو۔ یہ درجہ کا ہے کے ہیں؟ یہ حقیقت ”معرفت خدا“ کے درجے ہیں جتنی یہ معرفت قوی ہوگی اتنی ہی احساس فرائض زیادہ ہوگا اور اسی قدر افعال میں انضباط و انتظام پیدا ہوگا۔ اس لئے ”حسن عمل“ اگر ضروری چیز ہے تو اُس کے لئے ”معرفت خدا“ اور ”اعتقاد“ پہلے ضروری ہے۔ اور دنیوی و اخروی فلاح و نجات کا اُس پر انحصار یقینی ہے۔

## خدا کا وجود

اب تک میں نے ”خدا“ کو ایک مفروضہ شے قرار دیتے ہوئے اُس کی معرفت کی دستاویزوں اور اُن کے حل۔ اس کے بعد اُس کی ضرورت اور نظام عالم میں اُس کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا۔ اب منزل ہر اس کی



کہ خدا کے وجود کے متعلق روشنی ڈالی جائے کہ اُس کی ہستی کو مانا کیوں جائے؟ چونکہ دنیا میں جہاں مسئلہ میں اختلاف ہوا وہاں خدا کے وجود کا مسئلہ بھی محل اتفاق نہیں رہا۔ اُس میں آراء و خیالات کے تضادم نے ایک عظیم تفرقہ کی صورت پیدا کر دی ہے۔

ایک جماعت دنیا میں ایسی موجود ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کی منکر ہے اور کہتی ہے کہ اس عالم کے لئے کسی خاص خالق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہل مذاہب میں قطع نظر کیجئے اُس تفرقہ سے جو خود ان میں خدا کے اوصاف کے متعلق پایا جاتا ہے لیکن یہ سب اُس کے وجود کے قائل ہیں۔ میں نے اس سلسلہ بیانات کے شروع میں ”خدا“ کے اقرار و انکار کی تفریق کو اس طرح بیان کیا تھا کہ علم کے لئے ایک مبداء اول کے تو سب قائل ہیں لیکن بحث اس میں ہے کہ وہ کوئی ذی شعور اور صاحب ارادہ ہستی ہے یا نہیں۔ مادہ میں بھی اس عالم کے لئے ایک مبداء ملتے ہیں۔ وہ ذرات مادہ سہی مگر وہ اُس کو ذی شعور و ارادہ نہیں مانتے۔ اس کے مقابلہ میں وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں اُس کو صاحب شعور و ارادہ قرار دیتے ہیں۔ اب ان دونوں جماعتوں کے نقطہ نظر میں ایک دوسری سورت سے فرق سنئے۔ وہ لوگ جو مادیات و طبیعیات میں اور خدا کے وجود کے



منکر ہیں وہ اس عالم کے لئے کسی موجد کے قائل نہیں ہیں بلکہ اُس کے مادی اجزاء ہی کو اُس کے وجود کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ علم طبعی جو چیز عدم کے بعد ہو رہی آتی ہے اور مرکب ہے اُس میں چار چیزیں باعث وجود ہوتی ہیں۔ ایک وہ اجزاء جن سے مل کر یہ چیز بنتی ہے دوسرے وہ ہیئت جو ان اجزاء کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تیسرے وہ مقصد جو اُس کے غاء وجود میں آنے پر مترتب ہوتا ہے۔ چوتھے وہ بنانے والا جو ان اجزاء کو ترکیب دیکر اس صورت میں لاتا ہے مثلاً ایک دوا ساز جس نے ایک معجون تیار کیا جس کا اثر ہے دل و دماغ کو تقویت پہونچانا۔ اس میں وہ مفرد ادویہ جن سے یہ معجون بنا ہے پہلی چیز ہیں اور وہ صورت جو ان اجزاء کے ملنے سے حاصل ہوتی ہے دوسری چیز ہے۔ اور تقویت دل و دماغ تیسری چیز اور وہ دوا ساز جو اس معجون کو بناتا ہے چوتھی چیز ہے۔ یہ صورت ہر مرکب میں پائی جاتی ہے۔ ان میں سے پہلی چیز وہ ہے جسے اصطلاح میں "علت مادیہ" کہا جاتا ہے۔ اور آخری چیز وہ ہے جسے "علت فاعلیہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مادیہ اس عالم کائنات کے لئے صرف علت مادیہ کے قائل ہیں اور اُسے کافی سمجھتے ہیں۔ ان اجزاء کو "موجد کہنا درست نہیں ہے کیونکہ موجد تو اُس شے سے علحدہ ایک جداگانہ ہستی کہتا ہے



جو ان اجزا کو ترکیب دے کر اُس شے کو عالم وجود میں لائے اُسی کو  
 علت فاعلیہ کہتے ہیں جیسے مچون کے لئے دوا ساز، مکان کے لئے معمار، تخت  
 کے لئے تیار وغیرہ۔ اس کو مادیین تسلیم نہیں کرتے۔ وہ موجد یا علت فاعلیہ  
 کے منکر ہیں۔ خدا کو ماننے کے یہی ہیں کہ اس تمام دنیا کے لئے ایک موجد  
 ہے جو اس دنیا سے علیحدہ ہے اُسی کو خالق کہتے ہیں۔

اب درحقیقت بحث جو کچھ ہے ہمارے اور اُن کے درمیان وہ  
 یہ ہے کہ عالم کائنات کے لئے کسی ذی شعور موجد کی ضرورت ہے یا  
 نہیں۔ یعنی آیا اشیائے عالم خود بخود عالم وجود میں آگئے ہیں یا اُن کا  
 کوئی وجود میں لانے والا ہے۔

## ارادی اور غیر ارادی اشیاء کا تفرقہ

دنیا میں کوئی مسئلہ اُس وقت تک طے نہیں ہو سکتا جب تک کہ  
 اُس کے لئے کوئی باضابطہ معیار نہ مقرر کیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عالم میں بہت سی چیزیں بغیر ارادہ و اختیار کے  
 ہوتی ہیں۔ مرتعش کا ہاتھ تھرتھراتا ہے بغیر ارادہ و اختیار کے اور  
 کاتب کے قلم کو حرکت ہوتی ہے ارادہ کے ساتھ۔ ہڈیاں بکنے والے  
 کی زبان کی گردش، اس سے بھی الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ زبان کتنی



کھرتی، گھنٹی بڑھتی ہے اور حروف کی تشکیل کرتی ہے اور ایک خطیب بھی جب تقریر کرتا ہے تو اُس کی زبان بھی الفاظ اور حروف کو پیدا کرتی ہے مگر اس کو کتے ہیں اختیاری اور اُس کو کتے ہیں اضطراری۔ ایک آدمی کوٹھے پر سے پاؤں پھسلتا ہے زمین پر گر پڑتا ہے اور ایک آدمی کوٹھے پر سے پھانڈ پڑتا ہے۔ ذریعہ ایک ہے نتیجہ ایک ہے۔ وہ بھی اوپر سے نیچے آیا۔ یہی فضا اُس نے بھی ملے کی۔ مگر اُس کو نظری کتے ہیں اُس کو اختیاری۔ ایک دیوانہ ہے حالت جنون میں کچھ نہ کچھ کہتا ہے۔ کوئی اُس کی طرف اعتنا نہیں کرتا۔ اور ایک دانشمند انسان کلام کرتا ہے ہر شخص سننے لگتا ہے۔ توجہ کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ پہلا کلام ارادہ و شعور کا نتیجہ نہیں ہے۔ اور دوسرا شعور و ارادہ کے ماتحت ہے۔

آپ دنیا کی سیر کیجئے۔ اطراف زمین میں سیاحت فرمائیے۔ آپ کے سامنے مختلف طرح کے نقشے پیش ہونگے جن میں آسانی سے آپ پہنچ کر لیں گے کہ کون ان میں سے خود بخود موجود ہو گئے ہیں اور کون کسی باہوش ہستی کی کارگزاری کا نتیجہ؟

آپ کو معلوم ہے کہ ریگستان میں ہوا جو چلتی ہے وہ اپنے ساتھ ذرات ریگ کو لاتا ہے۔ اُن ہی سے بڑے بڑے ٹیلے ریت کے ہوجاتے



ہیں اور اُس کی وجہ سے کہیں نشیب ہو جاتا ہے کہیں فراز۔ کہیں پستی اور کہیں بلندی۔ آپ ان مناظر کو دیکھ کر کبھی یہ تجویز نہیں کرتے کہ کوئی اس میدان میں آیا تھا اور اُس نے خاص طور سے کہیں پلاؤ پکا کیا ہے اور کہیں کچھ نیچا بنکے اس کو دیکھ کر ہی سمجھ لیتے ہیں کہ ہوا کی وجہ سے اونچا نیچا ہو گیا ہے۔ مگر جھگل ہی میں جب کارواں سرائتی ہے جس میں آپ قیام کرتے اور آرام لیتے ہیں تو دل دعا دینے لگتا ہے کہ خدا بھلا کرے اُس کا جس نے یہاں اس مکان کی تعمیر کر دی۔ اسے دیکھ کر آپ نے یہ طے نہیں کیا کہ شاید ہوا کی حرکت کے اور ذرات کے اجتماع سے یہ مکان تیار ہو گیا ہو۔ دنیا جانتی ہے کہ زمین میں قوت استعمار ہے یعنی پتھر کی شکل میں ذرے مٹی کے تبدیل ہو جاتے ہیں اور آفتاب کی شعاعیں زمین کی تختیاں کے لحاظ سے ان اجزاء کو مختلف صورتوں میں رنگ دیتی ہے۔ ان ہی سے مختلف پتھر پیدا ہوتے ہیں عقیق۔ زمرہ۔ یاقوت۔ اور دھاتیں پیدا ہوتی ہیں۔ سونا چاندی۔ لوہا۔ تمام معدنیات کی یہی نوعیت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ پتھر جو زمین میں پیدا ہونگے کچھ نہ کچھ اُن کی ہندسی شکلیں بھی ہوں گی۔ کیونکہ شکل و مقدار ہر جسم کے لئے ضروری ہے۔ کوئی مثلث ہوگا اور کوئی مربع۔ کوئی مدور ہوگا اور کوئی مکعب۔ گمان کرو دیکھ کر آپ یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ کسی نے ان پتھروں کو اس طرح



تراش کر ان پہاڑوں میں دفن کر دیا ہے۔ آپ اس کو زمین کی قوت طبعی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن اسی زمین میں جب مختلف ظروف اور اس طرح کی چیزیں کھلائی دیں خاصہ نباتات سے متعلق ہیں جیسے کنگیز چھچھے دیگ۔ پتیلیاں وغیرہ تو انھیں عقلائے عالم نے زمین کی پیداوار قرار نہیں دیا بلکہ یہ رائے قائم کی کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب انسان اپنے ضروریات پتھروں سے پورے کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے ایک تاریخی دور کا انکشاف ہو گیا جس کا نام رکھا گیا "عصر پتھری" یعنی پتھر والا زمانہ۔ یہ کس لئے؟ آخر یہ کیوں نہ سمجھا گیا کہ جس طرح زمین میں بہت سے پتھر مختلف شکلوں کے پیدا ہوتے ہیں۔ اُسی طرح یہ چیزیں زمین میں طبعی قوت سے پیدا ہو گئی ہیں اور کسی شخص خاص کی کارگزاری کا نتیجہ نہیں ہیں۔

عہد قدیم میں تاریخ تو لکھی جاتی نہ تھی۔ اُس زمانہ کی تاریخیں اب انہی "حفریات" اور آثار قدیمہ کے ذریعہ سے مرتب کی جا رہی ہیں اس کے لئے ہمیں مقررہ کی جاتی ہیں اور بڑے بڑے علماء طبیعیات، علماء السنہ اور انجینیر جاتے ہیں۔ کھنڈروں کو بڑے بڑے ٹیلوں کو اور زمین کے مختلف حصوں کو کھود کر ایسی چیزیں برآمد کرتے ہیں جن سے سابقہ حالات کا پتہ چلے۔ وہاں کوئی بتانے والا



بیٹھا نہیں ہے مگر ہی خاموش آثار ہیں جن کے ذریعہ سے ہم پتہ لگاتے ہیں کہ اس زمانہ کے حالات یہ تھے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ کہیں پر تو آپ جلدی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ارادہ و اختیار کا نتیجہ ہے اور کہیں کہتے ہیں کہ بغیر ارادہ و اختیار خود بخود ہے یہ آخر معیار کون سا ہے؟ یہ کیا بات ہے کہ دیوانہ آپ کے سامنے باتیں کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ اس کا دماغ خراب ہے اور ایک فاضل مقرر تقریر کرتا ہے۔ آپ یہ شبہ نہیں کرتے کہ اس کا دماغ بھی خراب ہے اور اس دیوانگی کی رو میں یہ تقریر کر رہا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ مجنون کی تقریر کو مجنوناً سمجھنا پہلے سے اُس کے جنوں کا علم ہونے کی وجہ سے ہے اور مقرر کی تقریر کو نتیجہ عقل و فہم سمجھنا اس حسن ظن کی بنا پر ہے جو ہر انسان کے ساتھ ہونا چاہئے جب تک کافی ثبوت نہ ہو کسی کے متعلق انسان کو یہ رائے قائم کرنے کا حق نہیں کہ اُس کا دماغ خراب ہے۔

میں عرض کر دینگا کہ بندہ پرور! اول تو یہ حسن ظن ہے اور حسن ظن سے کبھی یقینی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا حالانکہ ہم اپنے وجدان کے خلاف سے اُن صورتوں میں جب ہمارے سامنے کوئی فاضلانہ تقریر غامضہ ہو یقین کا احساس رکھتے ہیں اس امر کے متعلق کہ یہ ایک وسیع علم



اور اک کا نتیجہ ہے۔ آپ ہی اپنے دل کی گہرائیوں میں اندازہ لگائیے کہ کسی اعلیٰ درجہ کے کاتب کی تحریر اور نقاش کے نقش یا برے قابل و لائق شخص کی تصنیف کو دیکھ کر جو اس کی تعریف کرتے ہیں تو کیا وہ صرف حسن ظن کی بنیاد پر ہے یعنی دل میں یہ شبہ موجود ہے کہ شاید اس کا دماغ خراب ہو اور جنون کے عالم میں یہ تحریر، نقش اور تصنیف عالم وجود میں آگئی ہو، ہرگز نہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کو یقین ہی کہ اس کا لکھنے والا بالکل صحیح الدماغ ہے اور اس نے قدرت و اختیار کے ساتھ اس کو لکھا ہے۔ اس امر کا اس درجہ یقین ہو گا کہ آپ اس خیال کو کوئی پیہرا دی طور پر وجود میں آیا ہے خود دیوانگی کا نتیجہ قرار دیجئے اور کہیں گے کہ یہ ہرگز عقل میں آنے کی بات نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف حسن ظن کا نتیجہ نہیں ہے۔

دوسرے یہ آپ کا بتایا ہوا معیار شکستہ ہوتا ہے اس طرح کہ وہی شخص جس کی تحریر و تحریر کی آپ تعریف کر رہے تھے خدا نخواستہ دیوانہ ہو جائے، اس کا دماغ خراب ہو جائے، ہلکی بہکی باتیں کرنے لگے تو آپ فوراً حکم لگا دیجئے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا اب آپ حسن ظن سے کام نہیں لیتے اور وہی مجنون جس کے متعلق سابق سے معلوم ہے کہ اس کا دماغ خراب ہے اگر اچھا ہو جائے۔



ٹھیک طور پر باتیں کرنے کے لئے تو آپ خود سمجھ لیں گے کہ وہ صحیح ہو گیا، اُس کا عارضہ دور ہو گیا۔ یہ آپ کیونکر اندازہ کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس کا سبب کچھ اور ہے اور کوئی ایسا معیار موجود ہے جس کی بنا پر خود افعال بتلاتے ہیں کہ اُن کا کرنے والا صاحب شعور اختیار ہے یا نہیں۔

پھر اُس آخری مثال میں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی وہ زمین سے نکلے ہوئے حروف اور مختلف طرح کے آلات و اسباب ان میں تو کوئی شخص سامنے ہی نہیں جس کی نسبت حسن ظن سے کام لیا جائے۔ یہاں صرف ایک بے زبان صنعت ہے جو بتلاتی ہے کہ اُس کا کوئی صنّاع ہے اور وہ صاحب ارادہ و اختیار ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ معیار جو بتلا یا گیا ہے درست نہیں ہے۔ چکر کیا معیار ہے؟ اچھا مجھ سے سنئے اور اگر اس کے علاوہ کوئی بات ٹھیک نہ آئے تو تسلیم کیجئے کہ یہی معیار درست ہے۔

وہ یہ ہے کہ جب کوئی بات اغراض و مقاصد کے موافق منظم و مرتب صورت سے ہوگی اور ایک خاص نظام اور توازن رکھتی ہوگی تو وہ شعور و اختیار کا نتیجہ قرار پائیگی۔ اور جب مقصد و غرض کے دائرہ میں کوئی نظم و ترتیب نہ ثابت ہو تو وہ شعور و اختیار کا صرف



منسوب نہ ہوگی۔

اسی معیار سے آپ ایک مجنون کے جنون و صحت کی حالت کا موازنہ کرتے ہیں۔ جب تک اُس کے الفاظ نامر بوط اُس کا کلام بے تسلسل ہے آپ سمجھتے ہیں کہ وہ جنون کا نتیجہ ہے۔ اور جس وقت سے اُس کے افعال و اعمال میں انتظام و ارتباط پیدا ہوا اور وہ اغراض و مقاصد کے ماتحت ہو گئے اُسی وقت سے آپ اُسے صاحب عقل سمجھنے لگے۔ جتنی ہی یہ بات زیادہ ہونی ہے اتنی عقل و شعور پر زیادہ روشنی ڈالتی ہے۔ یہی وہ معیار ہے جو صرف شعور و عدم شعور ہی کو نہیں بلکہ شعور و اختیار کے مختلف مراتب کا بھی پتہ دیتا ہے اور اُس کی مقدار کا تعین کرتا ہے۔ اگر کوئی دیوانہ علاج کے بعد اس درجہ پر آگیا کہ پانچ باتیں ٹھیک کہتا ہے اور چار باتیں بہک کر غلط کہتا ہے تو آپ سمجھتے ہیں کہ ابھی اس کا مرض پورے طور پر زائل نہیں ہوا یہ صحت کے قریب آگیا ہے اور اگر سب باتیں بالکل ٹھیک کرنے لگا تو آپ سمجھتے ہیں کہ اب بالکل اس کی عقل صحیح ہو گئی۔

اسی معیار کی بنیاد پر آپ ریگ کے تودوں کو ارادہ و اختیار کا نتیجہ نہیں قرار دیتے کیونکہ وہ کسی خاص مقصد و غرض کے ماتحت نظر نہیں آتے لیکن جھگل میں تمیر شدہ مکان یا سرائے کو آپ کسی



شخص کی کارگزاری کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

اسی بنا پر زمین کے پیدا ہونے والے معدنیات کو باوجود شکل و مقدار رکھنے کے آپ کسی خاص شخص کی سرورہ منسوب نہیں کرتے کیونکہ وہ شکلیں کسی خاص تناسب سے نہیں پائی جاتیں لیکن زمین سے نکلے ہوئے برتنوں کو انسانی کارگزاری وابستہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ انسانی ضروریات و اغراض سے تعلق ہیں۔

معلوم ہوا کہ ضروریات کے لحاظ سے تناسب، نظم اور ارتباط ہی وہ چیز ہے جو موجد کا پتہ دیتی ہے اور اس کے شعور و اختیار کی دلیل ہوتی ہے۔ حالانکہ آپ نے ان مثالوں میں موجد کو دیکھا نہیں تھا۔ بس یہی تھا کہ نقش کو دیکھ کر نقاش کا پتہ لگایا۔ صانع کو دیکھ کر صنم کی طرف ذہن کا انتقال ہوا۔

## موجد کی تلاش

دنیا کے مختلف صنائع جو آپ کے سامنے آتے ہیں ان میں قبل اس کے کہ آپ کو موجد کا پتہ چلے کہ کون ہے اجالا یہ ذہن میں آ جاتا ہے کہ کوئی موجد ہے۔ یہی پیش خیمہ ہوتا ہے اس سوال کا کہ اس کا موجد کون ہے؟



یہ انسان کی بالکل فطری اور تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ کون سے  
میں دھوکا ہوتا ہے اور اخلاط پیدا ہو سکتا ہے مگر کوئی ہے جس کو  
اخلاط نہیں ہوتا۔

یہ صنعتیں جو آپ کی نظر کے سامنے آتی ہیں۔ ان میں واقعی  
حیرتناک چیزیں پائی جاتی ہیں کیونکہ ہم اُن کے اسرار سے واقف  
نہیں ہیں۔ ریل۔ موٹر۔ جہاز اور ہوائی جہاز ہر ایک ہی ایجاد ہے  
اور ہم ان کے موجدین کی تعریف کرتے ہیں فرض کیجئے آپ جرمنی یا  
امریکہ کے کسی کارخانہ میں تشریف لے جائیے۔ لوہے کی مشینیں  
آپ کی نظر سے گزریں جو کونلہ اور پانی کی امداد سے چلتی ہیں۔ آپ  
ان مشینوں کو دیکھ کر حقیقتاً ششدر رہ جائیگا۔ مشین کے پرزے  
تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک عالم ہے جو حرکت میں ہے۔ آپ  
کہنے لگا کہ بنانے والے نے خوب مشین بنائی ہے۔ اب آپ کا سامنا  
آپ سے کہے اور ہمیں کھا کھا کر بیان کرے کہ کسی انسان کی کارگزاری  
کو اس میں دخل نہیں۔ لوہے کے ٹکڑے خود آئے مجتمع ہوئے  
اور ایک خاص شکل میں مرتب ہو گئے۔ کونلہ اپنے معدن کی تہ  
سے نکلا۔ یہاں پہونچا اور مشین کے اندر چلا گیا۔ پانی سمند سے  
کھینچ کر آیا اور اس میں بھر گیا۔ پھر آگ خود ہی رہی۔ دھواں بلند ہوا۔



اور مشین متحرک ہو گئی۔ وہ کے اور بہت زور دیکر سمجھانا چاہے مگر آپ اس کا کبھی یقین نہ کیجئے گا۔ آپ تین اور تین کا مجموعہ سات تسلیم کر لینا آسان سمجھیں گے، اس سے کہ ایک چلتی ہوئی مشین کام کرتے ہوئے انجن متحرک پُر زورے کو بغیر کسی ذی شعور محرک کے ساتھ تعلق کے تسلیم کریں۔

یہ کیوں؟ اس بنا پر کہ ان میں اغراض و مقاصد مضمحل ہیں اور ان ہی کے لحاظ سے ان میں توازن و تناسب قائم ہی اگر یہ مشینیں اس طرح کی ہوتیں کہ ان کے اجزاء بے ترتیب ہوتے نہ کوئی ربط ہوتا اور نہ کوئی مناسبت تو آپ تسلیم بھی کر لیتے کہ یہ اجزاء خود ہی مجتمع ہو گئے ہیں مگر چونکہ ان میں اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ترتیب قائم ہے اور مخصوص فوائد مضمحل نظر آتے ہیں اس لئے آپ سمجھتے ہیں کہ ان کا کوئی موجد تھا جو مناسبتوں سے واقف تھا اور صناعی پر قدرت رکھتا تھا۔ اسی نے ان کو ایجاد کیا ہے۔

پھر جب ہر چیز میں یہ اصول قائم ہے تو اس مجموعہ عالم کائنات میں آپ اس اصول سے محروم کیونکر ہو سکتے ہیں آپ اس عالم پر غور کیجئے۔ دیکھئے۔ اگر اغراض و مقاصد ملحوظ نہ ہوں



اور ضروریات کے لحاظ سے کائنات میں توازن و تناسب قائم ہو تو نہ تسلیم کیجئے کہ اس کا خالق ذی شعور اور صاحب اقتدار ہی ہو سکتا ہے لیکن اگر اس عالم کی چیزوں میں اغراض و مقاصد کے لحاظ سے تناسب پایا جاتا ہے تو پھر آپ کو ہمارا ہم آواز ہونا چاہئے کہ ضرور ان کا کوئی خالق ہے جو شعور و اختیار کا مالک ہے۔ چاہے اُسے دیکھا نہ ہو مگر سمجھ لیتا چاہئے کہ کوئی ہے ضرور۔

## نظام ایجاد

آپ اس دنیا کا جائزہ لیجئے تو آپ کو اس میں ترتیب نظام نظر آئے گا طبیعیات سے متعلق جتنے علوم و فنون ہیں ان سب کی بنیاد کائنات کے قائم شدہ ترتیب و نظام پر ہے ورنہ اگر دنیا سے ترتیب و نظام ختم ہو جائے تو نہ علم النبات کچھ ہے نہ علم الحيوانات نہ علم معاون نہ علم خواص الاشیاء وغیرہ سائنس کے تمام شعبے ختم ہو جائیں۔ یہ آئیے جتنے علوم ہیں سب مبنی ہیں فطرت کے نظام ارتباط اور ترتیب پر بلکہ یہ علوم صرف نام ہیں اُس ترتیب کے سمجھنے کا جو مختلف قسم کے اشیا



میں پائی جاتی ہے۔ جتنا اس ترتیب کو آپ زیادہ سمجھتے جاتے ہیں اتنا اسے علم کو کامل تر خیال کرتے جاتے ہیں۔

واقعی بے انصافی ہے کہ ہم ایک ایسے گہرے نظام کو جس کے اسرار و رموز پر غور کرنے میں گزشتہ ہزاروں برس میں عقلاء و مفکرین کی عقلیں صرف بوئیں اور آج تک ہمارا دماغ اس میں کسی آخری نقطہ تک نہیں پہنچا ہے۔ اور بہت سے اسرار ہیں جو اب تک سمجھ میں نہیں آئے ہیں۔ ایسی ترتیب اور ایسے نظام کو ہم فیثویہ خیر ارادی بے حس مادہ باطبیعت کے حوالہ کر دیں۔

## صناعی کی مثالیں

صنعت ہر زمانہ میں رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل صناعت میں ترقی بہت ہو گئی ہے۔ مگر صنعتوں کا وجود پہلے بھی تھا۔ یہ دیکھئے دروازہ 'اس کے بٹا اور چو کھٹ بازو۔ اس میں قبضے لگے ہیں۔ یہ دو لوہے کے ٹکڑے ایک دندانہ دار صورت پر بنائے گئے ہیں۔ بیچ میں ایک سلاخ لگا دی گئی ہے جو ان دونوں میں ارتباط پیدا کر دے قبضے اگر لوہے کے ٹکڑے سے ڈھلے ہوئے ہوتے تو جب دروازہ اور چو کھٹ بازو



جڑ دے جاتے تو دروازہ بھی جڑ جاتا۔ نہ کھل سکتا اور نہ بند ہو سکتا اور اگر دو لوہے کے ٹکڑے ہوتے الگ الگ جن میں کوئی جوڑ نہ ہو تو دروازہ دیو اسے الگ رہتا۔ مکان میں نہ لگ سکتا لیکن جب دو ٹکڑے ہوئے۔ اُن کے درمیان خاص طور سے ایک لوہے کی سلاخ کے ذریعہ سے وصل کیا گیا جس کی وجہ سے وہ دو ہونے کے ساتھ ایک ہو گئے۔ اب اُن کے ایک حصہ کو بازو کے ساتھ جڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرے حصہ کو دروازہ کے پٹ سے لگایا جاتا ہے۔ اس طرح دروازہ مکان میں لگ بھی جاتا ہے الگ نہیں رہتا اور پھر وہ درمیانی لوہے کی سلاخ محور بن کر اُسے کھلنے اور بند ہونے کا موقع دیتی ہے۔ جب چاہیں وہ کھل جاتا ہے اور جب چاہیں وہ بند ہو جاتا ہے۔ یقیناً غایت و مقصد کے لحاظ سے یہ ترتیب بتلاتی ہے کہ سمجھدار صنّاع کی ایجاد ہے اور سابق زمانہ کے لوگوں کی زہانت کا نتیجہ۔ مگر کیا انسان کے جسم میں بھی چوکھٹ بازو اور دروازہ کی صنعت زیادہ مکمل طور پر موجود نہیں ہے؟

یہ جوڑ بند اور مفصل۔ یہ بندیاں ہیں۔ ان کا جوڑنا مقصد یگر بالکل الگ الگ ہیں۔ یہ ربط قائم نہ ہو تو یہ ہاتھ کہنی کے نیچے سے



یونہی جھوٹا رہیگا۔ قابو میں نہیں آ سکے گا۔ اور اگر ان کو جڑ دیا جائے  
 بازو کی ہڈی میں تو یہ ہاتھ کھلے کا کھٹا رہ جائیگا یا بند کا بند رہ جائے گا  
 جس طرح اگر شروع سے آخر تک یہ ہاتھ ایک مسلم استخوان سے بنا  
 ہوا ہوتا تو اٹھنا بیٹھنا اور کام کرنا کسی صورت سے ممکن نہ ہوتا  
 مگر خدا دیکھئے تو کہ یہ کس ترکیب سے مدائے گئے ہیں۔ ان  
 ہڈیوں کے آخری سرے ایسے دندانوں کی شکل میں ہیں جو آپ  
 قبضوں کے دونوں پہلوؤں میں دیکھنے ہیں۔ اجتماع کے وقت  
 دونوں طرف کے دندانے ایک خاص متحدہ صورت سے اس  
 طرح ملتے ہیں کہ جدائی باقی نہیں رہتی۔ یہی ہر طرف کے درمیانی  
 شکاف میں دوسری طرف کا بلند حصہ داخل ہو کر متحدہ شکل پیدا  
 کر دیتا ہے۔ مگر ان دونوں کے ربط کے واسطے درمیانی سلاخ  
 کا ہونا جیسا کہ قبضوں میں ہوتا ہے ہاتھ کے رکھنے کیلئے اور دیگر  
 اعضاء و جوارح میں خاص خاص ضروریات زندگی میں خارج ہوتا  
 اس لئے ان اعضاء میں ارتباط کے لئے باریک باریک رگیں بھائی  
 گئیں اور جلد کا غلاف چڑھایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے  
 کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس مخلوق کو کس طرح کے ضروریات  
 پیش آئیں گے۔ پھر اگر غلاف جلد کا تنگ ہوتا تو ہاتھوں پیروں کے



سمیٹنے کی حالت میں جلد میں وہ کھنچاؤ پیدا ہوتا کہ کسی طرح بند کرنا اور سمیٹنا ممکن نہ ہوتا۔ مگر کیا کتنا اُس صنایع کا جو ان تمام حالات پر مطلع تھا۔ اُس نے جہاں جہاں جوڑ ہیں وہاں پر کثیر التعداد شکنیں یا چشیں دیدی ہیں کہ جس وقت ہاتھ پاؤں کھولا جاتا یا پھیلا یا جاتا ہے۔ وہ چشیں مجتمع ہو جاتی ہیں اور جب اُسے بند کیا اور سمیٹا جاتا ہے تو وہ چشیں کھنچ کر ایک تہی ہوئی شکل میں ہو جاتی ہیں۔ پھر کوئی شکن باقی نہیں رہتی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شکنیں مقدار ضرورت کا اندازہ کر کے رکھی گئی ہیں نہ اُس سے زیادہ ہیں نہ اُس سے کم۔

آپ آئہ عکاسی فوٹو گرافی کی مشین کو ملاحظہ فرماتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں اور ضرورت قابل تعریف ہے۔ ایک بند اور محدود صندوق کے اندر ایک ایسا شیشہ ہے جو سامنے کی ہر چیز کا عکس بے لینے کے قابل ہے۔ وہ عکس لیتا ہے اور خاص صورتوں سے اسے محفوظ بھی کر لیتا ہے اور پھر دواؤں کے ذریعہ سے اُسے صفحہ کاغذ پر منتقل بھی کر دیتا ہے۔

ایجاد ہے اور بہت اچھی ایجاد اور آپ کہنے لگا کہ اس کا موثر بڑے دماغ اور ذہانت کا انسان تھا۔ میں آپ کے ساتھ اس امر کو



متفق ہوں۔ مگر جب آپ اتنی صنعت کو ایک عقل اور شعور والے  
صناع کی طرف نسبت دیتے ہیں تو اگر آپ کے جسم میں یہ اس کے  
زیادہ مکمل صورت پر موجود ہو تو اسے طبیعت کی کرشمہ سازی اور  
اجزاء مادہ کی غیر ارادی حرکت کا نتیجہ قرار نہ دیکھئے۔

موجودہ آلات عکاسی میں کتنی کمزوریاں ہیں جس رخ پر آنے  
اُن کے شیشہ کو لگا دیا ہے جب تک آپ ہی انھیں دوسرے  
رخ پر نہ لگائیں وہ ادھر مڑ نہیں سکتے۔ ایک شیشہ پر جب  
ایک تصویر آگئی تو جب تک وہ تصویر محو نہ ہو یا اسے دھویا نہ  
جائے اور شیشہ بالکل صاف نہ کیا جائے۔ دوسری تصویر پھر  
اُس شیشہ پر نہیں آسکتی۔

شیشہ تصویر کو اپنے قد و قامت کے مطابق لگایا۔ اگر چھوٹا شیشہ  
ہے تو چھوٹی تصویر آئیگی چاہے وہ چیز بڑی ہو۔ اور بڑا شیشہ  
ہو تو بڑی تصویر لگے۔ چاہے وہ چیز چھوٹی ہو۔ اس کے معنی ہیں کہ  
اُس کی واقعی مقدار ظاہر نہ ہوگی۔ لیکن اب میں آپ کو ایسا  
آلہ عکاسی بتلاؤں جسے بنانے والے نے ایک بلند جگہ رکھا ہے  
تاکہ دور دور کی چیزوں کا آسانی سے تقابل ہو سکے۔ اس میں  
دروازے لگائے ہیں۔ جس کے پٹ بند ہوتے اور کھل جاتے



ہیں تاکہ گرد و غبار سے شیشے خراب نہ ہوں اور ان میں چلنیں لگائی ہیں جو دروازوں کے کھلے ہونے کی حالت میں اُٹھتی اور گر پڑتی ہیں۔ اُس میں ایک ایسی کل لگائی گئی ہے جس سے وہ شیشے چاروں طرف گھوم کر ہر طرف کے عکس لیتے رہتے ہیں یہ شیشے ایک عکس کو لیکر بیکار نہیں ہو جاتے نہ اُن کے بدلنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ دھونے صاف کرنے کی حاجت ہوتی ہے بلکہ خود ان میں یہ خاصیت ہے کہ صورت کو لیں بھی اور پھر سادہ بھی رہیں اور وہ صورت کو بھی نہ ہو بلکہ فوراً ایک خزانہ میں منتقل ہو جائے۔ جہاں وہ محفوظ رہے اور جب انسان چاہے وہ تصویر اُس البم سے نکل کر پھر اُس کے پیش نظر ہو جائے وہ شیشے ہر وقت تصویریں لیتے اور پھر ہر وقت سادہ اور دوری تصویر لینے کے لئے آمادہ ہیں۔ اُن کی تصویر اگر شرائط مقابلہ کے اعتدال کے ساتھ ہے تو اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی اصل اُس شے کی مقدار ہے چاہے وہ بڑی سے بڑی چیز کی صورت ہو اور چاہے چھوٹی سے چھوٹی چیز کی۔ بہر حال اُس کی اصلی مقدار محفوظ رہتی ہے یہ آلہ عکاسی کوئی اور نہیں۔ نظر اٹھائیے دیکھئے تو آپ کی دونوں آنکھیں ہی ہیں۔ اُنھیں کانٹہ سر میں جگہ دی گئی ہے



جو عمارت جسم کا بلند طبقہ ہے تاکہ دور کی چیزوں کا آسانی مقابلہ ہو سکے  
 اُن کے لئے پوٹوں کے دروازے قرار دیے گئے ہیں جو بوقت  
 ضرورت کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اُن کے لئے پلوں کی پلینیں  
 بنائی گئی ہیں جو اُنھستی اور گرد بڑھتی ہیں۔ اُن کو گردش کی طاقت  
 دی گئی ہے کہ یہ چاروں طرف کے نقشوں کو دے سکیں اور پشیر  
 نگاہ کر سکیں۔ ان دونوں آنکھوں میں عجب اتنا عمل قرار دیا گیا  
 ہے کہ ہیں دو مگر صورت جس کا احساس ہوتا ہے ایک ہے اور  
 وہ دونوں اُس صورت کو بیکر جس مشترک اور پھر حافظہ کے  
 خزانہ میں منتقل کر دیتی ہیں اور خود دوسری صورتوں کے ادراک  
 کے لئے سادہ رہتی ہیں وہ اپنی مختصر رہتی کے باوجود بڑے سے  
 بڑے پہاڑ دیا، سمندر کی تصویر لیتی اور اسے اتنا ہی دکھلاتی  
 ہیں جتنا وہ ہے۔ اُن کے محسوسات کا چھوٹا بڑا ہونا شرائط  
 روایت کے عدم اعتدال کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ فقط  
 اپنی عکس گرفتہ صورت کی ظاہری شکل اور ہندسی مقداری  
 کو نہیں دکھلاتیں بلکہ اُس کے رنگ روپ، حرکت اور سکون  
 کو بھی اصلی طور پر پیش کرتی ہیں جس میں اختلاف نہیں ہوتا۔ یہ  
 ہے ایک انسان کی دیکھنی ہوئی آنکھ۔ یہ ہے وہ آئینہ عکاسی جسکی



مثال دنیا کی طاقتیں پیش نہیں کر سکتیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنہا نازک شیشہ نہیں ہو سکتا۔ جتنا آنکھ کا بہرہ نازک ہے۔ مگر قدرت نے اُس کی حفاظت کے لئے عجب سامان رکھا ہے آپ ملاحظہ تو فرمائیے ایک بھرے بازار میں جہاں ہجوم زیادہ ہو ایک شیشہ کا گلاس بٹھیلی پر رکھ کر لے تو جائیے۔ دیکھئے گا کہ اس کا بچنا ایک بالکل غیر معمولی چیز ہے۔ مگر حوادثِ عالم میں انسان نہ معلوم کتنی مرتبہ گذرتا ہے کتنی جوشیں گنتی ہیں اور کتنی سخت چیزوں کا مقابلہ ہونا ہے۔ مگر شاذ و نادر وہ صورتیں ہوتی ہیں کہ آنکھ پر ضرب آجائے۔ یہ صرف قدرت کی طرف کا سامان ہے خطرناک چیز آنکھ کے سامنے آئے گی تو غیر ارادی طور پر پوٹے بند ہو جائیں گے۔

اسی طرح انسان کے اعضاء جو اسے سینکڑوں صنعتیں مضر ہیں جو علمِ بشر میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور ایک تحقیقات سے منکشف ہوتی جاتی ہیں۔ یہ بالکل کھلی ہوئی دلیل ہے اس کی کہ یہ نظام کسی صاحبِ دانش مہستی کا قائم کیا ہوا ہے۔ اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا کہ اگر یہ دنیا کسی ذی شعور و صاحب اختیار شخص کی کار کردگی کا نتیجہ نہیں ہے۔



تو پھر اُس میں اغراض و مقاصد کی تلاش کیوں ہوتی ہو۔  
 وہ لوگ جو دنیا کو نشو و ارتقاء طبعی کا نتیجہ مانتے ہیں وہ  
 خود ارتقاء کے ثبوت میں اس طرح استدلال پیش کرتے ہیں  
 کہ، ستم بعض حیوانات کے اعضاء میں بعض  
 چیزیں ایسی پاتے ہیں جن سے اس نوع کو کوئی فائدہ نہیں  
 پہنچ سکتا۔ جیسے انسان اور بعض جانوروں میں زکور کے  
 سینہ پر نشانات، حالانکہ اس کا فائدہ صنفِ اناث سے مخصوص  
 ہے اور زکور کے لئے اُن کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی طرح  
 آنتوں میں بعض حصے اور اسی طرح کے بعض دوسرے اجزاء  
 جن کا کوئی فائدہ اس نوع کی زندگی میں نہیں ہے۔ معلوم  
 ہوتا ہے کہ یہ اعضا کسی گزشتہ نوع کے پس ماندہ آثار ہیں  
 جو ان اعضا سے مستفید ہوتے تھے اور اُس کے نظامِ زندگی  
 میں ان اعضا کو مدخلیت حاصل تھی اب ترقی کر کے نوع  
 بدل گئی اس لئے اُن اعضا کی ضرورت جاتی رہی مگر آثار  
 اُن کے باقی ہیں۔

یہ استدلال صاف بتلاتا ہے کہ کہنے والا اس بات پر یقین  
 رکھتا ہے کہ جسمِ حیوانی کے ہر جزو کا کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہوا ہوگا۔



اگر ڈھونڈنے پر کوئی فائدہ نہیں ملتا تو وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ ضرورت  
س کے پہلے کوئی مخلوق ہوگی جو اس جزو سے فائدہ اٹھاتی ہوگی اس  
کے معنی یہ ہونے کہ یہ تسلیم شدہ چیز ہے کہ عالم کائنات میں ہر چیز کسی مصلحت  
اور مقصد سے ہے۔ مگر یہ بالکل عجیب بات ہے کہ ایک سائنس میں دنیا  
کی ہر چیز کو فائدہ و مقصد کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے اور دوسری  
سائنس میں ان تمام چیزوں کو بے حس و بے شعور طاقتوں کا نتیجہ  
قرار دیا جاتا ہے اور ان کے لئے کسی با اختیار ذاعل کی کارکردگی  
کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

یہ بھی تو ملاحظہ کیجئے کہ انسانی جسم میں اعضا و جوارح کتنے ہیں؛  
عروق و شراہین، اعصاب و عضلات سب کو شمار کیا جائے تو یہ ایک  
دنیا ہے جو موجود ہے۔ ان میں ڈھونڈنے کے بعد صرف دو چار  
چیزیں ایسی بتلائی جاتی ہیں کہ جن کا کوئی فائدہ اس نوع میں ظاہر  
نہیں ہوتا۔ مثلاً آنتوں میں ایک بڑھا ہوا ٹکڑا جس کو سری میں  
”سعاہوڑ“ کہتے ہیں یا کان کے بعض حصے یا سینہ پر کے نشانات۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ فیصدی ۹۸ چیزوں کے انسانی اجزاء  
میں فوائد دریافت ہو گئے ہیں اور صرف یہ دو ایک چیزیں رہ  
گئی ہیں جن پر زور دیا جاتا ہے کہ ان کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔“



مگر یہ انصاف آپ کے ہاتھ ہے کہ فیصدی ۹۸ چیزیں جن کے مقاصد فوائد سمجھ میں آگئے معیار بننے کے قابل ہیں اور ان سے یہ نتیجہ نکالا جائیگا کہ ان کا موجد عقل و شعور کا مالک ہے یا فی صدی دو چیزوں کو معیار بنا کر اُس کے عقل و شعور کی نفی کی جائے۔ پھر یہ فیصدی ۹۸ باتیں بھی جن کے اصل رموز بقول آپ کے آپ کی سمجھ میں آگئے ہیں یہ بھی تو ایک ہی دفعہ آپ کو معلوم نہیں ہو گئے بلکہ بہت باتیں تھیں جو سو برس پہلے آپ کو نہیں معلوم تھیں۔ اُس کے بعد معلوم ہوئیں اور یوں ہی تدریجی حیثیت سے ان تمام باتوں کا علم حاصل ہوا ہو پھر اب آپ کیوں نا امید ہو گئے ہیں کہ جو چیزیں باقی رہ گئی ہیں ان کے اسرار و رموز کا علم آپ کو مستقبل میں حاصل ہوگا۔ پھر یہ آپ قطعی حکم کیسے لگاتے ہیں کہ اس جزد کا اس نوع میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

کائنات عالم کی مصلحتیں عقلائے زمانہ کے لئے برابر منکشف ہوتی جاتی ہیں اور میں سچ کہتا ہوں کہ جتنی دنیا ترقی کرے گی اور آگے بڑھے گی اتنے دلائل وجود خدا زیادہ پیدا ہوتے جائیں گے اور عقل انسانی خدا کی معرفت سے قریب ہوتی جائیگی۔



## کائنات پر مجموعی حیثیت کا نگاہ

اس عالم کے اجزاء کو ایک دوسرے پر مبنی ہونے کی حیثیت سے  
اگر دیکھا جائے گا تو سلسلہ طولانی ہو گا اور منزل دور ہو جائیگی۔ علامہ  
نتیجہ پھر دی ہو گا اس لئے اس تمام کائنات کو ایک مجموعہ کی صورت  
میں خیال کیجئے اور اس مجموعہ کے متعلق اس پر غور کیجئے کہ یہ بذات خود  
وجود کا متقاضی ہے یا نہیں۔ اگر یہ اپنی ذات کے ساتھ وجود کا حقدار  
اور اس کا متقاضی ہوتا تو اس میں ناپائیداری بے ثباتی  
تغییر انقلاب نظر نہ آتا۔ اس لئے کہ یہ عالم تمام و کماں وجود کا تقاضا  
رکھتا ہے اور ہوشے ذاتی تقاضے سے ہوتی ہے وہ ذات سے  
جدا نہیں ہو سکتی۔

اگر وجود اس کے لوازم ذات سے ہوتا تو اس میں عدم  
کی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ پھر اس عالم کی کسی شے کے بھی تصور کے  
وقت یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی کہ وہ ہے یا نہیں۔ کیونکہ  
سوال کی صورت تو اس وقت ہو جب دونوں پہلو یکساں حیثیت  
سے محل رکھتے ہوں یعنی ”ہونا“ بھی گنجائش رکھتا ہو اور  
”نہونا“ بھی گنجائش رکھتا ہو۔ یقیناً اگر وجود اجزاء کے عالم میں



بحیثیت ذات ہوتا تو اُن کا تصور اُن کے وجود کا پتہ دینے کے لئے کافی ہوتا کیونکہ ہستی تو خود اُن کی ذات میں مضمر ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر شے کا جب ہم تصور کرتے ہیں تو پہلے وہ شے ذہن میں آتی ہے پھر ہماری عقل مصروف جستجو ہوتی ہے کہ آیا یہ موجود ہے یا نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز ذاتی حیثیت سے وجود و عدم کی طرف یکساں نسبت رکھتی ہے۔ نہ کوئی خاص تعلق اس کو وجود کے ساتھ ہے نہ کوئی خاص رشتہ عدم کے ساتھ۔ پھر جب بذات خود اس میں کسی ایک بات کا بھی تقاضا نہیں ہے تو اس میں وجود کو عدم پر ترجیح کیونکر ہوتی ہے۔ یقیناً اس کے لئے کوئی خارجی سبب ہونا چاہئے جس کے ذریعہ سے عالم وجود میں آئے اور وہ خارجی سبب ایسا ہو کہ جس کی ذات ہی میں وجود مضمر ہے۔ اُسی کو واجب الوجود کہتے ہیں۔ اور وہی اس تمام عالم کائنات کا خالق ہے۔

## مستی کے لئے مرکز کی ضرورت

دنیا میں ہر چیز اپنے مرکز کا پتہ دیتی ہے۔ مثلاً ایک خوردہ فروشی کی دکان پر آپ تشریف لے جائے وہاں منفرد چیزیں نظر آئیں گی۔ مٹھور اسکا کاغذ رکھا ہوا ہے، کچھ قلم رکھے ہوئے ہیں، کچھ دوائیں بھی



ہوتی ہیں۔ کچھ قفل رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بساطی کی دوکان پر۔ آپ  
 غور کرتے ہیں تو یہ تمام چیزیں آپس میں کوئی احتیاج نہیں رکھتی ہیں  
 یعنی کاغذ کو قلم کے ساتھ ان دونوں کو دوات کے ساتھ۔ ان تینوں  
 کو قفل کے ساتھ کوئی ایسا تعلق نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے یہ چیزیں ایک  
 ساتھ ہی ہوں تو ہوں۔ اس لئے آپ کی عقل طے کرتی ہے کہ ان میں  
 سے ہر ایک کا اصل مخزن دوسرے سے علیحدہ ہے جہاں سے تھوڑی  
 تھوڑی مقدار میں اکریہ مجتمع ہو گیا ہے اور ان میں سے ہر شے کو اس کے  
 کلی وجود یا مرکز اجتماعی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں دوسری  
 چیز اس کی شریک نظر نہ آئیگی۔ پیپل میں کاغذ ہی کاغذ ہوگا۔ قلم  
 نہ ہوئے۔ قلم کے اصل کا رخانہ میں کاغذ نہیں ہوگا۔ دواتوں کے  
 اصل مرکز میں قفل نہیں ہونگے اور علیٰ ہذا القیاس۔  
 یہ اُن سب کے جزئی وجود کا نتیجہ تھا کہ وہ دوسری چیزوں کے  
 ساتھ قلمود ہوئے نہ ہر ایک بذات خود ایک الگ مرکز رکھتا ہے  
 جہاں وہی وہ وہ ہر اس کا غیر نہیں ہے۔

دوسری مثال موالید ثلاثہ عناصر سے مرکب ہیں۔ ہوا، پانی، آگ  
 مٹی۔ ان سب کے اجتماع سے ایک سموائی ہوئی کیفیت پیدا ہوئی۔ یہ  
 سموائی ہوئی کیفیت ان کے اجتماعی شکل کا نتیجہ ہے۔ لیکن ان میں



ہر عنصر اپنے لئے ایک مرکز رکھتا ہے اور وہ اُس کا مستقل وجود ہے بن  
میں سے ہر جزو اپنے اُس کُل کا پتہ دیتا ہے اور اُس کُل میں پھر دوسرے  
عناصر کی شرکت نہیں ہو سکتی۔

دنیا کے کائنات میں جب ہم نے جائزہ لیا تو ہمیشہ وجود و عدم ساتھ  
ساتھ تھے۔ ہستی و نیستی ہمعناں دکھائی دی یعنی ہر شے میں ہستی کا پہلو بھی  
ہے اور نیستی کا بھی لیکن جب ہم ذاتِ ہستی پر غور کرتے ہیں تو وہ نیستی کی  
محتاج نہیں ہے اور نہ نیستی ہستی کی پابند ہے۔ س کے لئے جب ہم  
عقل پروردہ دیتے ہیں تو ہم ایسی نیستی کا پتہ ملتا ہے جہاں ہستی  
شریک نہیں ہے اور وہ محالات ہیں۔ ایسے عدم کا اصل مرکز سمجھنا  
چاہئے لیکن اب دوسرے جزو کے لئے بھی مرکز تلاش ہونا چاہیے یعنی ایسی  
ہستی کہ جس میں نیستی کا گزرنہ ہو۔ اس کا نام ہے واجب الوجود جس کے  
ساتھ عدم کسی طارح شریک نہیں ہے۔

## تقائق کی سرحد سے لایہ و کمال کا سراغ

جب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو وجود کے ساتھ تقاضے نظر  
آتے ہیں اور ان تقاضے کے لحاظ سے ہم مختلف مہیات و طبائع میں  
ان اشیاء کو مندرج کرتے ہیں مثلاً ہم کو ایک درجہ وہ ملتا ہے جہاں



شے اپنے اجزا کو محفوظ رکھتی ہے یعنی اپنے وجود کو بحال لیتی ہے مگر پھر اُس کو تبعا نہیں سکتی اور ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کا نام ہے ”جماد“ پھر وہ درجہ ہے جہاں شے کی ہستی محفوظ بھی رہتی ہے اور پھر اُس میں اضافہ کی بھی صلاحیت ہے اور ترقی بھی ہوتی ہے جس کا نام ہے ”نشو و نما“ اس قسم کا نام ہوا نباتات۔ اس کے بعد وہ چیزیں آئیں جن میں جس دشواری پایا جاتا ہے۔ یہ ہوتے ”حیوانات اور اس کے بعد منزل ہی جہاں معلومات کے جہولات کے پتہ لگانے اور علمی و علمی ترقیوں کی قسط ہے اُس کا نام ہے ”انسان“۔

آپ غور فرمائیے تو یہ مختلف طبائع کی تفریق اور مختلف انواع کی تشکیل صرف اُن مدد و قیود سے ہوئی ہے جو وجود کے ساتھ منضم ہوئے ہیں۔ مثلاً جماد کیا ہے۔ وہ جو اپنے اجزا کو مجتمع رکھتا ہے اور اس ”اس“ بس کے مفہوم سے نوع جماد کی تشکیل ہوئی مدد و قیود تو ان سب میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ ایک حد اور قید ہے جو وجود پر عائد ہوئی۔ پھر آگے بڑھے۔ آپ نے کہا نشو و نما کی طاقت ہے اور اس ”اس“ بس سے نوع نباتات کی تشکیل ہوئی۔ یوں ہی اس کے آگے بڑھے اور جس حرکت ارادی کی حد قائم کی تو حیوان اور عقل کی حد قائم کی تو انسان کی نوع تیار ہو گئی۔ وہ چیز جو ان میں مشترک ہو جسمیت“



محدود پابندی کا نام ہے یعنی طول اور عرض اور عمق میں قابل انقسام ہونا جس کا لازمی نتیجہ ہے مکان اور خمیر کی احتیاج۔ یہ نقص ہے جس نے وجود کے ساتھ مل کر اسے جسم بنادیا اور یہ نقص تمام جسمانی اشیاء میں کمیت کے ساتھ پایا جانا ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ عالم کائنات جو مختلف طبقات و مہیات پر مشتمل ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ حدود و جہات کا مجموعہ! یہ حدیں آتی کہاں سے ہیں؟ عدم کی طرف سے یعنی جہات پر سے کمال نے ساتھ چھوڑا اور اس کے آگے کچھ نہیں کی صدا آتی وہیں ایک نوع تیار ہو گئی۔ مگر یہ حدود لگائے کلبے میں جاتے ہیں؟ وجود میں۔ یہ عالم کائنات صرف ان حدود کا نام ہے جو وجود کے ساتھ لگائی جاتی ہیں اب یہ وجود کہاں سے آتا ہے۔ ان حدود سے نہیں اس لئے کہ وہ تو عدمی پہلو ہیں جو وجود کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں۔ اس کے لئے یقیناً ایک اصل وجود ماننا ضروری ہے جس میں کوئی حدود قید نہ ہو۔ اسی وجود غیر محدود یا کامل صفتی کا نام واجب الوجود ہے۔

حدوث و امکان اس نیستی کی شرکت کا لازمی نتیجہ ہے جو محدود ہونے کے ساتھ وجود میں پیدا ہوتی ہے اور جب وجود غیر محدود ہے اس میں ہستی ہی ہستی ہوگی۔ نیستی کا پتہ نہ ہوگا اسی لئے اس میں کوئی وقت ایسا فرض بھی نہ کیا جاسکے گا جس میں وہ معدوم ہو یا معدوم ہو سکے۔



بد سمجھنے کے کائنات کی محدود ہستی میں اسی نقص کی بنا پر جو حد بندی سے پیدا ہو گیا ہے احتیاج کی صفت آگئی ہے اور احتیاج خود محتاج الیہ کا پتہ دیتی ہے۔ جب کائنات کی تمام چیزوں میں ہم کو احتیاج نظر آرہی ہے تو ایک مرکز استغناء ماننا ضروری ہے جو اس تمام کائنات کے واسطے معدن فیض قرار پائے اور ان تمام مختلف چیزوں کو اسی کے کمال سے حصہ رسی کی کمالات کی دولت حاصل ہو۔

”آتش فنی بالذات“ ہستی کو ”واجب الوجود“ کہتے ہیں۔ وہی خدا ہے۔

## ذی حیات مخلوق سے نیکو خالق کا پتہ

عالم کے جنے موجودات میں ان میں اگر صرف جہانیت ہوئی اور جہانیت کے خواص طبعی حرکت و سکون اور اجتماع و افتراق یہ مادہ کے خواص ہیں۔ یہی چیزیں اگر دنیا کے کائنات میں ہم کو نظر آتیں تو پھر شاید ہم مان لیتے کہ ان کا باعث صرف مادہ ہے لیکن کائنات کی کسی ایک قسم میں بھی حس و شعور کا ہونا اور ارادہ و اختیار کے جوہر کا پایا جانا یہ بتلاتا ہے کہ اس کے مبادی و اسباب میں کہیں کہیں عقل و شعور کی قوت مضمر ہے کیونکہ فرع اصل سے زیادہ نہیں ہو سکتی اور ایک شے میں کوئی بات جب خود نہیں ہے تو وہ دوسرے کو عطا کیسے کر سکتی ہے



اگ گرم ہے، پانی کو گرم کرگی۔ برف سرد ہے خلی بجھے گی۔ لیکن کوئی شے خود گرم یا سرد نہ ہو اور وہ دوسرے میں یہ صفتیں پیدا کر دے۔ غیر ممکن ہے۔ کسی نہ کسی طور سے اس خاصیت کا مضمحل ہونا ضروری ہے خواہ وہ حتی حیثیت سے نہ ہو طبعی حیثیت سے ہو۔ اسی طرح کائنات میں عقل و شعور ارادہ و اختیار کا ہونا۔ ہرگز اجازت نہیں دیتا یہ کہنے کی کہ اس کا سبب اصل بالکل عقل و شعور کی صفت سے خالی ہو۔

پھر چونکہ سلسلہ اسباب کا دور تک ہے لیکن آخر میں وہ مبدأ اول پر منتهی ہوتا ہے۔ اور درمیانی سلسلہ میں عقل و شعور کا پتہ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو کیا فائدہ، کیونکہ سوال پیدا ہوگا کہ اس درمیانی سلسلہ میں یہ جو ہر کہاں سے آیا۔ اس نے ضرورت ہے یہ ماننا جائے کہ مبدأ اول عقل و شعور اور ارادہ و اختیار کا مالک ہے اور اسی نے اپنے مخلوقات میں بس کو چاہا ہے یہ صفت عطا کی ہے۔

## معرفت خدا کے طریقے

خدا کی معرفت کے لئے بہت سے ذرائع بتلائے گئے ہیں اور ایک فلسفی نے یہاں تک کہا ہے کہ خدا کی معرفت کے راستے بعد و نقاس مشبہ ہیں یعنی جتنی سائنسیں انسان جیتا ہے اتنے ذریعہ معرفت باری



کے ہیں۔ لیکن مسلک کی حیثیت سے مختلف جماعتوں نے جو مختلف راستے اختیار کئے ہیں وہ تین ہیں۔ پہلا مسلک باطنیہ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل کے ذریعہ سے خدا کی معرفت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اپنی زمانہ میں ایک انسان تلاش کر لینا چاہئے۔ اور اسی کے ذریعہ سے خدا تک پہنچنا چاہئے۔ یہ طریقہ خداوند عالم کی اجمالی معرفت کے بعد اُس کے صفات جمال و جلال کی تفصیلی واقفیت میں توجہ قابل قبول ہو سکتا ہے مگر اصل اُس کے وجود کی تصدیق اور اجمالی معرفت کے لئے اس طریقہ کو معین کرنا بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر عقل کا قدم در میان سے نکال دیا گیا تو اُس مرشد کامل کی شناخت اور اُس کے قول پر عمل کرانے ہی کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ آخر ہم تلاش کیوں کریں اور مرشد کے پاس کیوں جائیں اور اُس کی بات کیوں سنیں اور اُس پر عمل کس لئے کریں۔ بہ سب باتیں تو عقل کے ساتھ ہیں۔ دوسرا مسلک عرفاء و صوفیہ کا ہے وہ ریاضت نفس اور جلالت باطن کے بعد کشف و اشراق کے ذریعہ سے خدا کی معرفت حاصل کرنے کے مدعی ہیں۔ اس میں بحث کرنا ہی بیکار ہے کیونکہ وہ اپنی اہل سے تو کوئی سروکار نہیں۔ بہر حال یہ طریقہ منکر اور جاہل کے لئے کچھ مفید نہیں۔ جس کے واسطے کشف



ہو گیا اُس کے لئے بس ہو گیا لیکن جو اس شرف سے محروم ہے اُس کو ہم ماننے کی دعوت کیسے دے سکتے ہیں۔

جسٹس کرامت حسین صاحب، آکچہاں ایک فلسفی کی حیثیت رکھتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ خدا کی معرفت فطرت سے متعلق ہے اور وجدانیاں میں سے ہے یعنی بھوک جس کو لگی ہو بس وہی بھوک کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر بغرض محال کسی کو بھوک لگے ہی نہیں تو اُسے سمجھایا نہیں جاسکتا کہ بھوک کیا چیز ہے۔ دسی ہی خدا کی معرفت ہے اس کا بھی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص خدا کو نہیں مانتا وہ قابل الزام نہیں ہے۔ اور نہ کسی طرح اُس کو قائل کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا طریقہ حکماء کا ہے۔ یہ دلائل و براہین کے ذریعہ سے خدا کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اہل عقل کے لئے یہی واحد طریقہ سمجھنا اور سمجھانے کا ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے بھی اسی طریقہ کی حمایت کی ہے لیکن استدلال کے لئے بھی پھر راستے جدا جدا ہو جانے میں اس کے لئے قرآن نے دو راستے اہل عالم کو دکھلائے ہیں۔ آفاق اور انفس۔

ارشاد ہوتا ہے:۔ سَنُرِيْمُ الْاِيْتَانِی الْاَفَاقِ وَفِی الْاَنْفُسِ  
دکھانے میں ہم اُن کو اپنی نشانیاں آفاق عالم میں اور



نفوس کے اندر

معلوم ہوا کہ ایک طرف ہیں تمام آفاق یعنی زمین و آسمان کی  
دریائی کائنات اور دوسری طرف خود نفس انسانی۔ اور وہ نکتہ  
دانِ رموز معرفت جو امت اسلامیہ میں مدرسۃ الکیات کا سب سے  
بڑا معلم تھا، یعنی امیر المومنین علی بن ابیطالبؑ انھوں نے دوسرے  
شعبہ کو بڑی اہمیت دی اور فرمایا۔

من عرف نفسه فقد عرف ربه " جس نے اپنے نفس  
کو پہچانا اس نے خدا کو پہچان لیا۔"

یہ عجیب چیز ہے "خود شناسی ذریعہ بن رہی ہے خدا شناسی کا  
اب اس کی صورتیں مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے نفس کے تقاضے  
کو جس نے سمجھ لیا وہ خدا کے کمال کا پتہ لگا لے گا۔ دوسرے یہ کہ  
اپنے نفس کے خصوصیات و کمالات کو سمجھے گا وہ خدا کے کمال کا  
ادراک کر سکے گا۔ یہ وہ چیز ہے جسے میں نے آپ کے سامنے اس  
عنوان سے پیش کیا تھا کہ کائنات میں عقل و شعور کا وجود خالق  
کی حیات و قدرت کا پتہ دیتا ہے۔ اس تمام دنیا میں انسان ہی  
ہے جس میں سب سے زیادہ کمالات مجتمع ہیں۔ اس میں وہ  
جسمانیت بھی ہے جو تھیلوں میں موجود ہے۔ وہ نشو و نما بھی ہے



جوتاباتات میں ہے۔ وہ حس و حرکت بھی ہے جو حیوانات میں پائی جاتی ہے اور سب کے آخر میں غیر محسوس چیزوں کا ادراک بھی انسان کے دماغ میں مضمر ہے۔

اب اگر خدا کی معرفت حاصل کرنا ہو تو قریب ترین ذریعہ اس کا یہ ہے کہ وہ اسی انسان کی ہستی پر غور کرے کہوند وہ عقل و شعور اور صفت ادراک کا منظر ہے۔ اور جب اسے آئینہ قرار دیا جائے گا خالق کی معرفت کا تو یہ سمجھ میں آئیگا کہ اس کا خالق یقیناً عقل و شعور کا مالک ہے اور ایک قادر و مختار ہستی ہے۔

آپ غور فرمائیے تو معلوم ہو گا کہ خود شناسی کا ذریعہ اگر نہ ہوتا تو خدا کی معرفت اتنی ہمہ گیر نہ ہو سکتی جتنی اب ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں ان سب کا ادراک انسان کو کچھ آلات و اسباب کے ذریعہ سے ہوتا ہے جتنی کچھ چیزیں دیکھنے کی ہیں کچھ سننے کی۔ کچھ چکھنے کی۔ کچھ سونگھنے کی اور کچھ چھونے کی موجودات عالم میں نمایاں سے نمایاں چیز آفتاب ہی مگر اس کا جرم نورانی قوت باصرہ کا طالب ہے۔ اگر سمجھ جائے کہ اس نے کرے تو اس کا ادراک نہیں ہو گا اس کی تیز شعاعوں کی حرارت قوت لمسہ کے تعلق ہے۔ یہ قوت الہیہ موجود ہو تو اس کا ادراک غیر ممکن ہے۔ دوسری



خدا کی تمام بڑی اور چھوٹی مخلوق خواہ پہاڑ ہوں۔ خواہ دریا۔ خواہ درخت ہوں اور خواہ آسمان اور اُس کے اجرام۔ اب اگر خدا کی معرفت انہی کائنات عام کے ساتھ وابستہ ہوتی تو ایسا شخص جس کے حواس ظاہر معطل ہیں۔ فوت باصرہ مفقود ہے۔ سامعہ بیکار ہے اور قوت ذائقہ یوں ہی دوسری طاقتیں مصروف عمل نہیں ہیں۔ ایسا شخص خدا کے وجود کا پتہ نہیں لگا سکتا۔ فرض کیجئے ایک انسان قید خانہ میں پیدا ہوا اور کال کوٹھری میں آنکھ کھولی جہاں نہ آسمان تھا نہ زمین دکھلائی دینی تھی۔ نہ گرجتے ہوئے بادل نہ برستا ہوا پانی نہ بہتے ہوئے دریا اور نہ رگڑنے ہوئے پھول اور سلہا تا ہوا سبزہ۔ خدا کی اس حیرت انگیز مخلوق میں سے اُس نے کسی چیز کا بھی مشاہدہ نہیں کیا۔ وہ تمام چیزیں جو آفاق میں دلیل قرار پا سکتی ہیں کبھی اُس کو نظر ہی نہیں آئیں۔ اب کیا کہئے گا اس شخص پر محبت خدا تمام نہیں ہوتی۔ کیونکہ خدا کا وجود تو انھیں نشانیوں سے سمجھ میں آتا ہے ان ہی اس آیت میں پیش کیا گیا ہے :-

ن فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفَلَكَ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَى بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَارَأَ



فہما من کل دابة و تصریف الریاح و السحاب المسخرین فیہا  
و الاہل فی کایات لقوم یعقلون۔

”یقیناً خلقت میں آسمان و زمین کی اور آمد و رفت میں شب و  
روز کی اور ان کشتیوں میں جو دریاؤں کے اندر چلتی ہیں لوگوں کے  
فائدہ کی چیزوں کو لیکر اور جو خدا آسمان سے پانی برساتا ہے تو اس  
سے زمین کو زندہ کرتا ہے اس کے مرچنے کے بعد اور جو پھیلائے  
ہیں اس نے زمین میں جانور۔ ہواؤں کی گردشیں اور وہ  
بادل جو آسمان و زمین کے درمیان خدا کے قبضہ قدرت میں موجود  
ہیں ان سب میں نشانیاں ہیں ان کے لئے جو صاحب عقل ہیں“  
اگر خدا کی نشانیاں نہ ہوتیں ان ہی چیزوں میں تو وہ  
پابند زندان انسان جس نے آنکھیں کھولیں قد فانی ہی میں  
بے شک خدا کے پہچاننے سے معذور ہوتا مگر خدا نے ایک نشانی  
ایسی قرار دی ہے جو تمام مادی ذرائع سے بے نیاز ہے۔ وہ خود  
انسان کا نفس ہے۔ یہ مرکز و اس ظاہر یہ کا محتاج نہیں ہر ایک کو  
اپنا احساس ہے کہ میں ہوں۔ کیا آپ مھو کر دیکھتے ہیں کہ میں ہوں؟  
یوں سمجھتے ہیں کہ میں ہوں۔ دیکھتے ہیں اپنے تنہا تو معلوم ہوتا ہے  
کہ میں ہوں اپنی آواز سنتے ہیں جب معلوم ہوتا ہے کہ میں ہوں



اپنی خوشبو سونگتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے؛ کچھ بھی نہیں۔ بلکہ اگر کسی انسان کے تمام حواس معطل ہوں تو خود ایسا ہونا ہی اپنی تئیں بتلاتا ہے کہ میں ہوں۔ دنیا کی تمام چیزوں کا ادراک صورت کا محتاج ہے کہ وہ صورتیں ذہن میں آئیں تب ان کا ادراک ہو۔ مگر یہ ایسا ہی وجود ہے جو بغیر صورتوں کے واسطے کے اپنے تئیں بتلاتا ہے۔ اور جب یہ انسان کی ہستی خود خدا کے وجود کی دلیل ہے تو اب خدا کی معرفت بھی اس کی پابند نہیں رہی اور نہ مادی ذرائع کی محتاج تمام حواس معطل ہوں مگر اُدھر انسان کو خود اپنے وجود کا احساس پیدا ہوا بس اُسی کے ساتھ خالق کے وجود کی دلیل بھی قائم ہو گئی اور اُس کو ماننے کا راستہ مل گیا۔

یہ انسان کا نفس، اگر انسان نے اس کو سمجھ لیا تو خدا کو سمجھ لیا۔ بات یہ ہے کہ یہ انسان جب اپنی حاجتوں پہنچنے ضرورت پر نظر ڈالے گا تو اسے اپنے مافوق کسی خالق کسی فیض رساں ہستی کی تلاش پیدا ہوگی۔ اب اگر اُس فیض رساں ہستی کو اُس نے دھوٹا دھنا چاہا تو وہ دنیا کا جائزہ لے گا لیکن ہر چیز کو اپنے سے پست پائیگا کیونکہ وہ اس کائنات میں سب سے اشراف ہے۔ اُس نے اگر اس دنیا کی کسی چیز کے سامنے سر جھکا دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ



اُس نے اپنے تئیں پہچانا نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بت پرست  
 بتوں کے سامنے جھک گئے اس لئے کہ اپنے تئیں پہچانا نہ تھا۔ ستارہ  
 پرست ستاروں کے لئے سرسجود ہو گئے۔ س نے کہ اپنے نہیں نہیں  
 پہچانا تھا۔ آفتاب پرست آفتاب کے سامنے سرنگوں ہوئے۔ صرف  
 اس وجہ سے کہ اپنے تئیں پہچان نہ سکے تھے۔ لیکن اگر اپنے تئیں پہچان  
 لیتے کہ ہم کون ہیں تو کبھی اپنے سے پست چیزوں کے سامنے سرخرو نہ  
 کرتے۔ یہ انسان اگر اپنے تئیں پہچان لے تو اُسے معلوم ہوگا کہ کائنات  
 کی کوئی شے میرے تقابہ پر نہیں ہے۔ اُسے دنیا اپنے سامنے ہیچ نظر  
 آئیگی اور اس لئے وہ عالم امکان میں کسی شے کو اپنا معبود مانتے پہ  
 طیار نہ ہوگا۔ اب چونکہ وہ یہ طے کر چکا تھا کہ میری بھی فیض رساں  
 ہستی کوئی ضرور ہے۔ اس لئے اُس کی نگاہ عالم امکان سے بالا  
 تر متوجہ ہوگی اور وہ اُن تمام تقاضوں سے الگ ہو کر جو امکان و  
 حدوث کا لازمہ ہیں کمال و وجوب کی طرف رخ کرے گا اور اس طرح  
 ”خود شناسی“ پورے طور پر ”خدا شناسی“ کا ذریعہ قرار پائیگی۔

**خدا کے وجود پر ائمہ معصومین کے بیان**  
 خداوند عالم کے وجود کے لئے ائمہ معصومین نے ہر انسان کے



بسیار عقل و دماغ کے مطابق دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ کبھی سلمیٰ ذہن رکھنے والے سادہ طبیعت اشخاص کے لئے اور کبھی باریک نگاہ اور کمزور فلسفہ کے لئے اور یہ حقیقت ہے ہی ایسی جسے ایک بلند نگاہ فلسفی انتہائی دقیق اور غامض دلائل سے ثابت کرتا ہے تو ایک معمول انسان اپنے فہم کے مطابق بالکل سادہ الفاظ میں وہی اسکان و محدث اور معلول و علت کا استدلال جو فلسفی اصطلاحات کے جال میں پھنس کر ہفتواں بن جاتا ہے اُسی کو ایک ضعیف العمر بڑھیا بالکل آسان طریقہ سے کہہ دیتی ہے اُس وقت جب اُس کے سامنے چرخاب ہے اور وہ کات رہی ہے۔ کوئی پوچھتا ہے کیا خدا ہے؟ وہ کہتی ہے "ضرور" پوچھتا ہے کیونکر؟ کہتی ہے۔ دیکھو! یہ چرخاب تک میں اسے چلاتی رہتی ہوں۔ چلتا رہتا ہے اور ادھر میں نے ہاتھ روکا بس یہ چرخاب رک گیا۔ پھر جب یہ اتنا سا چرخاب بغیر میرے چلائے نہیں چلتا تو اتنا بڑا دنیا کا انتظام بغیر کسی منتظم کے کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ یہ حقیقت وہی فلسفی استدلال ہے جو اتنے آسان طریقہ سے سادی صورت پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ائمہ معصومین علیہم السلام انھوں نے ایک ہی بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اور یہی مفید



طریقہ ہدایت کا ہو سکتا ہے۔ مطلب ایک تھا۔ لفظیں بدلی  
 ہوئی تھیں۔ منزل ایک۔ راستے جدا جدا۔ کبھی ایک فلسفی کے  
 انداز پر ابوشاکر ویحانی سے ارشاد فرمایا جب اُس نے پوچھا  
 ما الدلیل علی ان لا صنعا "کیا دلیل ہے اس بات کی کہ  
 آپ کا کوئی خالق ہے؟" ازم حفر صادق نے فرمایا:-

وحدت نفسی لا تخبر من احدی جہتین اما ان  
 اکون صنعها وکانت موجودة او صنعها وکانت معدومة  
 فان کنت صنعها وکانت موجودة فقد استغنت بوجودها  
 عن صنعها وان کانت معدومة فانه تعلم ان المعدوم  
 لا یحدث شیئا فقد ثبت المعنی الثالث ان لنا صناعا و هو الله  
 رب العلمین

"میرا نفس جبکہ وہ اپنے وجود کا خود باعث ہو تو در صورتوں  
 سے خالی نہیں یا تو وہ اپنے وجود کا باعث ہو جبکہ وہ موجود تھا یا وہ  
 اس کے وجود کا باعث ہو جبکہ وہ معدوم تھا اگر وہ اپنے وجود  
 کا باعث ہو جبکہ موجود تھا تو پھر اُس کو دوبارہ وجود پیشہ کی ضرورت  
 کیا تھی اور اگر وہ اُس کے وجود کا باعث ہو جبکہ وہ معدوم تھا  
 تو وہ وجود عطا کرنے کا باعث کیونکہ ہو سکتا ہے کیونکہ معدوم کسی



شے کو موجود نہیں بنا سکتا لہذا تیسری صورت ثابت ہوئی کہ اپنے وجود کا باعث یہ خود نہیں ہے بلکہ کوئی اور اُس کا خالق ہے اور وہ اللہ ہے جو تمام جانوں کا پروردگار ہے۔

کبھی بالکل سادہ الفاظ ان عربوں کے ماحول پر نہ کر کے ہوئے مخائب کو اس طرح سمجھایا گیا کہ۔۔

البعد قد تدلّ علی البعید والروثة تدلّ علی الحمیر واما  
القد تدلّ علی المسیر فہذا ۱۱ یصلّی العلوی ۱۲ ۱۳ اللطیف  
وہذا ۱۴ کذا ۱۵ غلی ۱۶ ۱۷ کثافة ۱۸ یف ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰ ۱۰۱ ۱۰۲ ۱۰۳ ۱۰۴ ۱۰۵ ۱۰۶ ۱۰۷ ۱۰۸ ۱۰۹ ۱۱۰ ۱۱۱ ۱۱۲ ۱۱۳ ۱۱۴ ۱۱۵ ۱۱۶ ۱۱۷ ۱۱۸ ۱۱۹ ۱۲۰ ۱۲۱ ۱۲۲ ۱۲۳ ۱۲۴ ۱۲۵ ۱۲۶ ۱۲۷ ۱۲۸ ۱۲۹ ۱۳۰ ۱۳۱ ۱۳۲ ۱۳۳ ۱۳۴ ۱۳۵ ۱۳۶ ۱۳۷ ۱۳۸ ۱۳۹ ۱۴۰ ۱۴۱ ۱۴۲ ۱۴۳ ۱۴۴ ۱۴۵ ۱۴۶ ۱۴۷ ۱۴۸ ۱۴۹ ۱۵۰ ۱۵۱ ۱۵۲ ۱۵۳ ۱۵۴ ۱۵۵ ۱۵۶ ۱۵۷ ۱۵۸ ۱۵۹ ۱۶۰ ۱۶۱ ۱۶۲ ۱۶۳ ۱۶۴ ۱۶۵ ۱۶۶ ۱۶۷ ۱۶۸ ۱۶۹ ۱۷۰ ۱۷۱ ۱۷۲ ۱۷۳ ۱۷۴ ۱۷۵ ۱۷۶ ۱۷۷ ۱۷۸ ۱۷۹ ۱۸۰ ۱۸۱ ۱۸۲ ۱۸۳ ۱۸۴ ۱۸۵ ۱۸۶ ۱۸۷ ۱۸۸ ۱۸۹ ۱۹۰ ۱۹۱ ۱۹۲ ۱۹۳ ۱۹۴ ۱۹۵ ۱۹۶ ۱۹۷ ۱۹۸ ۱۹۹ ۲۰۰ ۲۰۱ ۲۰۲ ۲۰۳ ۲۰۴ ۲۰۵ ۲۰۶ ۲۰۷ ۲۰۸ ۲۰۹ ۲۱۰ ۲۱۱ ۲۱۲ ۲۱۳ ۲۱۴ ۲۱۵ ۲۱۶ ۲۱۷ ۲۱۸ ۲۱۹ ۲۲۰ ۲۲۱ ۲۲۲ ۲۲۳ ۲۲۴ ۲۲۵ ۲۲۶ ۲۲۷ ۲۲۸ ۲۲۹ ۲۳۰ ۲۳۱ ۲۳۲ ۲۳۳ ۲۳۴ ۲۳۵ ۲۳۶ ۲۳۷ ۲۳۸ ۲۳۹ ۲۴۰ ۲۴۱ ۲۴۲ ۲۴۳ ۲۴۴ ۲۴۵ ۲۴۶ ۲۴۷ ۲۴۸ ۲۴۹ ۲۵۰ ۲۵۱ ۲۵۲ ۲۵۳ ۲۵۴ ۲۵۵ ۲۵۶ ۲۵۷ ۲۵۸ ۲۵۹ ۲۶۰ ۲۶۱ ۲۶۲ ۲۶۳ ۲۶۴ ۲۶۵ ۲۶۶ ۲۶۷ ۲۶۸ ۲۶۹ ۲۷۰ ۲۷۱ ۲۷۲ ۲۷۳ ۲۷۴ ۲۷۵ ۲۷۶ ۲۷۷ ۲۷۸ ۲۷۹ ۲۸۰ ۲۸۱ ۲۸۲ ۲۸۳ ۲۸۴ ۲۸۵ ۲۸۶ ۲۸۷ ۲۸۸ ۲۸۹ ۲۹۰ ۲۹۱ ۲۹۲ ۲۹۳ ۲۹۴ ۲۹۵ ۲۹۶ ۲۹۷ ۲۹۸ ۲۹۹ ۳۰۰ ۳۰۱ ۳۰۲ ۳۰۳ ۳۰۴ ۳۰۵ ۳۰۶ ۳۰۷ ۳۰۸ ۳۰۹ ۳۱۰ ۳۱۱ ۳۱۲ ۳۱۳ ۳۱۴ ۳۱۵ ۳۱۶ ۳۱۷ ۳۱۸ ۳۱۹ ۳۲۰ ۳۲۱ ۳۲۲ ۳۲۳ ۳۲۴ ۳۲۵ ۳۲۶ ۳۲۷ ۳۲۸ ۳۲۹ ۳۳۰ ۳۳۱ ۳۳۲ ۳۳۳ ۳۳۴ ۳۳۵ ۳۳۶ ۳۳۷ ۳۳۸ ۳۳۹ ۳۴۰ ۳۴۱ ۳۴۲ ۳۴۳ ۳۴۴ ۳۴۵ ۳۴۶ ۳۴۷ ۳۴۸ ۳۴۹ ۳۵۰ ۳۵۱ ۳۵۲ ۳۵۳ ۳۵۴ ۳۵۵ ۳۵۶ ۳۵۷ ۳۵۸ ۳۵۹ ۳۶۰ ۳۶۱ ۳۶۲ ۳۶۳ ۳۶۴ ۳۶۵ ۳۶۶ ۳۶۷ ۳۶۸ ۳۶۹ ۳۷۰ ۳۷۱ ۳۷۲ ۳۷۳ ۳۷۴ ۳۷۵ ۳۷۶ ۳۷۷ ۳۷۸ ۳۷۹ ۳۸۰ ۳۸۱ ۳۸۲ ۳۸۳ ۳۸۴ ۳۸۵ ۳۸۶ ۳۸۷ ۳۸۸ ۳۸۹ ۳۹۰ ۳۹۱ ۳۹۲ ۳۹۳ ۳۹۴ ۳۹۵ ۳۹۶ ۳۹۷ ۳۹۸ ۳۹۹ ۴۰۰ ۴۰۱ ۴۰۲ ۴۰۳ ۴۰۴ ۴۰۵ ۴۰۶ ۴۰۷ ۴۰۸ ۴۰۹ ۴۱۰ ۴۱۱ ۴۱۲ ۴۱۳ ۴۱۴ ۴۱۵ ۴۱۶ ۴۱۷ ۴۱۸ ۴۱۹ ۴۲۰ ۴۲۱ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۲۴ ۴۲۵ ۴۲۶ ۴۲۷ ۴۲۸ ۴۲۹ ۴۳۰ ۴۳۱ ۴۳۲ ۴۳۳ ۴۳۴ ۴۳۵ ۴۳۶ ۴۳۷ ۴۳۸ ۴۳۹ ۴۴۰ ۴۴۱ ۴۴۲ ۴۴۳ ۴۴۴ ۴۴۵ ۴۴۶ ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۹ ۴۵۰ ۴۵۱ ۴۵۲ ۴۵۳ ۴۵۴ ۴۵۵ ۴۵۶ ۴۵۷ ۴۵۸ ۴۵۹ ۴۶۰ ۴۶۱ ۴۶۲ ۴۶۳ ۴۶۴ ۴۶۵ ۴۶۶ ۴۶۷ ۴۶۸ ۴۶۹ ۴۷۰ ۴۷۱ ۴۷۲ ۴۷۳ ۴۷۴ ۴۷۵ ۴۷۶ ۴۷۷ ۴۷۸ ۴۷۹ ۴۸۰ ۴۸۱ ۴۸۲ ۴۸۳ ۴۸۴ ۴۸۵ ۴۸۶ ۴۸۷ ۴۸۸ ۴۸۹ ۴۹۰ ۴۹۱ ۴۹۲ ۴۹۳ ۴۹۴ ۴۹۵ ۴۹۶ ۴۹۷ ۴۹۸ ۴۹۹ ۵۰۰ ۵۰۱ ۵۰۲ ۵۰۳ ۵۰۴ ۵۰۵ ۵۰۶ ۵۰۷ ۵۰۸ ۵۰۹ ۵۱۰ ۵۱۱ ۵۱۲ ۵۱۳ ۵۱۴ ۵۱۵ ۵۱۶ ۵۱۷ ۵۱۸ ۵۱۹ ۵۲۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۲۳ ۵۲۴ ۵۲۵ ۵۲۶ ۵۲۷ ۵۲۸ ۵۲۹ ۵۳۰ ۵۳۱ ۵۳۲ ۵۳۳ ۵۳۴ ۵۳۵ ۵۳۶ ۵۳۷ ۵۳۸ ۵۳۹ ۵۴۰ ۵۴۱ ۵۴۲ ۵۴۳ ۵۴۴ ۵۴۵ ۵۴۶ ۵۴۷ ۵۴۸ ۵۴۹ ۵۵۰ ۵۵۱ ۵۵۲ ۵۵۳ ۵۵۴ ۵۵۵ ۵۵۶ ۵۵۷ ۵۵۸ ۵۵۹ ۵۶۰ ۵۶۱ ۵۶۲ ۵۶۳ ۵۶۴ ۵۶۵ ۵۶۶ ۵۶۷ ۵۶۸ ۵۶۹ ۵۷۰ ۵۷۱ ۵۷۲ ۵۷۳ ۵۷۴ ۵۷۵ ۵۷۶ ۵۷۷ ۵۷۸ ۵۷۹ ۵۸۰ ۵۸۱ ۵۸۲ ۵۸۳ ۵۸۴ ۵۸۵ ۵۸۶ ۵۸۷ ۵۸۸ ۵۸۹ ۵۹۰ ۵۹۱ ۵۹۲ ۵۹۳ ۵۹۴ ۵۹۵ ۵۹۶ ۵۹۷ ۵۹۸ ۵۹۹ ۶۰۰ ۶۰۱ ۶۰۲ ۶۰۳ ۶۰۴ ۶۰۵ ۶۰۶ ۶۰۷ ۶۰۸ ۶۰۹ ۶۱۰ ۶۱۱ ۶۱۲ ۶۱۳ ۶۱۴ ۶۱۵ ۶۱۶ ۶۱۷ ۶۱۸ ۶۱۹ ۶۲۰ ۶۲۱ ۶۲۲ ۶۲۳ ۶۲۴ ۶۲۵ ۶۲۶ ۶۲۷ ۶۲۸ ۶۲۹ ۶۳۰ ۶۳۱ ۶۳۲ ۶۳۳ ۶۳۴ ۶۳۵ ۶۳۶ ۶۳۷ ۶۳۸ ۶۳۹ ۶۴۰ ۶۴۱ ۶۴۲ ۶۴۳ ۶۴۴ ۶۴۵ ۶۴۶ ۶۴۷ ۶۴۸ ۶۴۹ ۶۵۰ ۶۵۱ ۶۵۲ ۶۵۳ ۶۵۴ ۶۵۵ ۶۵۶ ۶۵۷ ۶۵۸ ۶۵۹ ۶۶۰ ۶۶۱ ۶۶۲ ۶۶۳ ۶۶۴ ۶۶۵ ۶۶۶ ۶۶۷ ۶۶۸ ۶۶۹ ۶۷۰ ۶۷۱ ۶۷۲ ۶۷۳ ۶۷۴ ۶۷۵ ۶۷۶ ۶۷۷ ۶۷۸ ۶۷۹ ۶۸۰ ۶۸۱ ۶۸۲ ۶۸۳ ۶۸۴ ۶۸۵ ۶۸۶ ۶۸۷ ۶۸۸ ۶۸۹ ۶۹۰ ۶۹۱ ۶۹۲ ۶۹۳ ۶۹۴ ۶۹۵ ۶۹۶ ۶۹۷ ۶۹۸ ۶۹۹ ۷۰۰ ۷۰۱ ۷۰۲ ۷۰۳ ۷۰۴ ۷۰۵ ۷۰۶ ۷۰۷ ۷۰۸ ۷۰۹ ۷۱۰ ۷۱۱ ۷۱۲ ۷۱۳ ۷۱۴ ۷۱۵ ۷۱۶ ۷۱۷ ۷۱۸ ۷۱۹ ۷۲۰ ۷۲۱ ۷۲۲ ۷۲۳ ۷۲۴ ۷۲۵ ۷۲۶ ۷۲۷ ۷۲۸ ۷۲۹ ۷۳۰ ۷۳۱ ۷۳۲ ۷۳۳ ۷۳۴ ۷۳۵ ۷۳۶ ۷۳۷ ۷۳۸ ۷۳۹ ۷۴۰ ۷۴۱ ۷۴۲ ۷۴۳ ۷۴۴ ۷۴۵ ۷۴۶ ۷۴۷ ۷۴۸ ۷۴۹ ۷۵۰ ۷۵۱ ۷۵۲ ۷۵۳ ۷۵۴ ۷۵۵ ۷۵۶ ۷۵۷ ۷۵۸ ۷۵۹ ۷۶۰ ۷۶۱ ۷۶۲ ۷۶۳ ۷۶۴ ۷۶۵ ۷۶۶ ۷۶۷ ۷۶۸ ۷۶۹ ۷۷۰ ۷۷۱ ۷۷۲ ۷۷۳ ۷۷۴ ۷۷۵ ۷۷۶ ۷۷۷ ۷۷۸ ۷۷۹ ۷۸۰ ۷۸۱ ۷۸۲ ۷۸۳ ۷۸۴ ۷۸۵ ۷۸۶ ۷۸۷ ۷۸۸ ۷۸۹ ۷۹۰ ۷۹۱ ۷۹۲ ۷۹۳ ۷۹۴ ۷۹۵ ۷۹۶ ۷۹۷ ۷۹۸ ۷۹۹ ۸۰۰ ۸۰۱ ۸۰۲ ۸۰۳ ۸۰۴ ۸۰۵ ۸۰۶ ۸۰۷ ۸۰۸ ۸۰۹ ۸۱۰ ۸۱۱ ۸۱۲ ۸۱۳ ۸۱۴ ۸۱۵ ۸۱۶ ۸۱۷ ۸۱۸ ۸۱۹ ۸۲۰ ۸۲۱ ۸۲۲ ۸۲۳ ۸۲۴ ۸۲۵ ۸۲۶ ۸۲۷ ۸۲۸ ۸۲۹ ۸۳۰ ۸۳۱ ۸۳۲ ۸۳۳ ۸۳۴ ۸۳۵ ۸۳۶ ۸۳۷ ۸۳۸ ۸۳۹ ۸۴۰ ۸۴۱ ۸۴۲ ۸۴۳ ۸۴۴ ۸۴۵ ۸۴۶ ۸۴۷ ۸۴۸ ۸۴۹ ۸۵۰ ۸۵۱ ۸۵۲ ۸۵۳ ۸۵۴ ۸۵۵ ۸۵۶ ۸۵۷ ۸۵۸ ۸۵۹ ۸۶۰ ۸۶۱ ۸۶۲ ۸۶۳ ۸۶۴ ۸۶۵ ۸۶۶ ۸۶۷ ۸۶۸ ۸۶۹ ۸۷۰ ۸۷۱ ۸۷۲ ۸۷۳ ۸۷۴ ۸۷۵ ۸۷۶ ۸۷۷ ۸۷۸ ۸۷۹ ۸۸۰ ۸۸۱ ۸۸۲ ۸۸۳ ۸۸۴ ۸۸۵ ۸۸۶ ۸۸۷ ۸۸۸ ۸۸۹ ۸۹۰ ۸۹۱ ۸۹۲ ۸۹۳ ۸۹۴ ۸۹۵ ۸۹۶ ۸۹۷ ۸۹۸ ۸۹۹ ۹۰۰ ۹۰۱ ۹۰۲ ۹۰۳ ۹۰۴ ۹۰۵ ۹۰۶ ۹۰۷ ۹۰۸ ۹۰۹ ۹۱۰ ۹۱۱ ۹۱۲ ۹۱۳ ۹۱۴ ۹۱۵ ۹۱۶ ۹۱۷ ۹۱۸ ۹۱۹ ۹۲۰ ۹۲۱ ۹۲۲ ۹۲۳ ۹۲۴ ۹۲۵ ۹۲۶ ۹۲۷ ۹۲۸ ۹۲۹ ۹۳۰ ۹۳۱ ۹۳۲ ۹۳۳ ۹۳۴ ۹۳۵ ۹۳۶ ۹۳۷ ۹۳۸ ۹۳۹ ۹۴۰ ۹۴۱ ۹۴۲ ۹۴۳ ۹۴۴ ۹۴۵ ۹۴۶ ۹۴۷ ۹۴۸ ۹۴۹ ۹۵۰ ۹۵۱ ۹۵۲ ۹۵۳ ۹۵۴ ۹۵۵ ۹۵۶ ۹۵۷ ۹۵۸ ۹۵۹ ۹۶۰ ۹۶۱ ۹۶۲ ۹۶۳ ۹۶۴ ۹۶۵ ۹۶۶ ۹۶۷ ۹۶۸ ۹۶۹ ۹۷۰ ۹۷۱ ۹۷۲ ۹۷۳ ۹۷۴ ۹۷۵ ۹۷۶ ۹۷۷ ۹۷۸ ۹۷۹ ۹۸۰ ۹۸۱ ۹۸۲ ۹۸۳ ۹۸۴ ۹۸۵ ۹۸۶ ۹۸۷ ۹۸۸ ۹۸۹ ۹۹۰ ۹۹۱ ۹۹۲ ۹۹۳ ۹۹۴ ۹۹۵ ۹۹۶ ۹۹۷ ۹۹۸ ۹۹۹ ۱۰۰۰

”یعنی تمہیں اس میں اگر اونٹ کی میکانا نظر آئی تو تم سمجھو گے کہ کوئی اونٹ دوسرے گزرا ہوا نہ اگر گزرا ہوا ہو تو اس کا تپہ جلیگا اور پیروں کا نشان کسی امہ کا پتہ دینگے چروہا آسمان میں طاق کے ساتھ اور یہ میں اس کثافت کے ساتھ بیٹھ کر خدمت باریک میں باخبر کے جوئی دینے ہونگے۔ اس میں ایک بیہوشی اور جھگی انسان کے سامنے آنی والی چیزوں کو پیش کرنے کے یہ سمجھایا گیا ہے کہ ہر اثر کا ایک اثر ہو جائے اور ہر شے اپنے سبب کا پتہ دیتی ہے۔

کبھی نفسیات کے ذریعہ سے ثابت کیا۔ جب ایک شخص نے پوچھا کہ آپ نے اپنے خدا کو کیونکر پہچانا فرمایا۔

عرفتہ بالی بفسخ العزائم ونقص اللحم اذا عزمت ففسخ عظمی



## واذا حممت فنقص حمتی

”میں نے اپنے خدا کو پہچانا مضبوط ارادوں کے ٹوٹ جانے سے اور سمیٹوں کے پست ہو جانے سے۔ جب میں کوئی ارادہ کرتا ہوں وہ میرے ارادہ کو شکست دیتا ہے اور جب بہت باندھتا ہوں بہت کچھ ہٹتا ہے۔“  
 معنوم ہوتا ہے کہ کوئی بالادست طاقت ہے جو ہمارے ارادوں کے مافوق ہے۔

اور کبھی وجدانیات کے ذریعہ سے سمجھایا۔ جس وقت کہ ایک دہریہ سے گفتگو بہت طویل ہوئی۔ امام نے فرمایا کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ تو کشتی پر سوار ہوا اور طوفان آیا کشتی بالکل سمجھا رہی تھی اور کوئی ساحل قریب نہ تھا اور نہ کوئی درخت نظر آتا تھا۔ نہ کوئی شخص تھا جو تجھ کو بچائے۔ اُس نے اقرار کیا کہ ہاں ایسا واقعہ پیش آیا ہے حضرت نے فرمایا ”بیچ بتانا کہ کیا اُس وقت بھی دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کوئی اس وقت بھی مجھے بچا سکتا ہے؟ اُس نے کہا بے شک کچھ تو ڈھارس تھی۔ فرمایا بس ایسے وقت میں جس سے امید وابستہ ہوتی ہے وہی ضل ہے۔“





## منکرین خدا کا سرمایہ

جن جماعتوں نے خدا کے وجود کا انکار کیا ہے اگر ان کے دہل کی تحلیل کی جائے اور ان کے بیانات کو دیکھا جائے تو سب کا حاصل عدم علم قرار پاتا ہے۔ یہ کوئی دعویٰ کرے کہ کائنات خود بخود پیدا ہوئی ہے اور اس کا ثبوت بتیہ کرے۔ ایسا نہیں ہے۔ منکرین کا نام سرمایہ صرت شک و شبہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ہماری عقل اس کے وجود کو نہیں بتلاتی اور ہتہ نہیں دیتی۔ ظاہر ہے کہ عدم علم کبھی مقابلہ نہیں کر سکیگا ان دلائل کا جو ثبوت میں قائم ہوں۔ جب تک وہ دلائل فلفلہ نہ ثابت کر دیے جائیں۔

فرض کیجئے کہ مادیہ مشاہدہ کے ذریعہ سے مادہ کے اجزاء اور ان کے حرکات ہم کو اپنی آنکھوں سے دکھلا دیں حالانکہ ایسا نہیں ہے مادہ خود ان دیکھی چیز ہے جس پر خواہ مخواہ زیان لے آیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل بعد میں آئیگی، پھر بھی تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس مادہ سے مافوق کوئی با اختیار طاقت نہیں ہے۔ یہ مادہ کے اجزاء ہر حال وہ اجزاء ہو سکتے ہیں کہ جن سے کائنات عالم وجود میں آتی ہے۔ یہ وہ مشین کے ہر ذرے ہیں جو متحرک ہیں لیکن ان کے حرکات



سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ کسی عقل و حکمت کے ماتحت ہیں یا نہیں اس کا اندازہ اُن کے نظم و ترتیب سے ہو سکتا ہے۔ اور جبکہ دنیا کا نظم و ترتیب ہم کو ایک عظیم حکمت و دانش کا پتہ دے رہا ہے تو ہم اُس کے لئے ایک فاعل مختار ماننے پر مجبور ہیں اس نے ہمارے اور مادیات کے درمیان جو چیز خط فاصل بنتی ہے اور جہاں پر آکے بحث رکتی ہے وہ مادہ کا ثبوت اور اُس کا ابطال نہیں ہے بلکہ اُس مادہ کا خلقت کائنات کے لئے کافی ہونا اور نہ ہونا یعنی وہ مادہ اور اُس کے حرکات کو کافی قرار دیکر خالق سے بے نیاز بنا چاہتے ہیں اور ہم مادہ اور اُس کے تغیرات کے ہوتے ہوئے بھی ایک خالق کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں جو اپنی حکمت اور مصلحت کے ساتھ مادی اشیاء کو عالم وجود میں لائے۔

## مادیات کا مذہب اے راسخ فی تبصرہ

مادیات کا خیال ہے کہ دو چیزیں ہیں مادہ اور قوت۔ ان ہی دو چیزوں کی بدولت تمام کائنات عالم وجود میں آتی ہے۔ مادہ کیلئے اس کی حقیقت میں بہت بڑا اختلاف ہے اور اس کا سمجھنا بہت مشکل قرار دیا گیا ہے۔ بہر حال مادہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالم میں اس طرح



بھیلا ہوا ہے کہ ازل سے لیکر اس وقت تک اُس میں ایک رقی بھرا ہوا  
 ہو سکا ہے اور نہ رقی بھرا اُس میں کی ہوئی ہے۔ بالکل ایک مقدار پر  
 اور ایک درجہ پر وہ رہا ہے۔ جتنی چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُن میں  
 انقلاب پیدا ہوتا ہے وہ فنا کبھی نہیں ہوتیں بلکہ صورت میں تبدیلی  
 ہو جاتی ہے۔ آگ پر پانی کو رکھا۔ آگ نے جلا دیا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ  
 فنا ہو گیا۔ مگر فنا نہیں ہوا۔ جس وقت اُس میں حرارت پہنچی تو وہ آواز  
 بھاپ بن کر۔ پانی نہیں رہا صورت جاتی رہی لیکن وہ اجزاء ہر حال  
 کسی نہ کسی صورت میں قائم ہیں۔ اسی طرح آپ نے زمیں میں بیج  
 بویا۔ اب وہ پتی کی شکل میں نمودار ہوا تو کیا کوئی نئی چیز عالم وجود میں  
 آئی؟ نہیں! بلکہ وہ زمین کے اجزاء تھے جن میں قوت نامیہ نے  
 سرایت کی اور وہ درخت کی شکل میں آگے کوئی نیا مادہ نہیں  
 پیدا ہوا۔ مادہ ناقابل زوال ہے۔ ازل سے ازل اس کے سے کسی  
 خالق کی ضرورت نہیں۔

ایک زمانہ میں فلاسفہ کا مسلک یہ تھا کہ سب سے پہلے پانی ہے  
 اور اصل مبادی تمام چیزوں کا وہی پانی ہے اور وہ مفرد و منحصر ہے تمام  
 اشیاء کا اُس کے بعد معلوم ہوا کہ پانی بھی مرکب ہے۔ قدیم فلاسفہ  
 نے حار و سرد و تر و خشک۔ آگ۔ پانی۔ خاک۔ ہوا۔ اب جہاں تک



تحقیق ہوئی ہے اُس سے معلوم ہوا ہے کہ نشو کے قریب عناصر مفرد و مرکب ہیں۔ دنیا کی چیزوں میں بعض مرکب ہیں اور بعض مفرد ہیں بعض اشیاء ان میں سے دو دو سے مل کر تیار ہوتے ہیں جیسے پانی جو دو سے مرکب ہے۔ بعض میں تین چار۔ اور بعض میں اس سے بھی زیادہ چیزیں شریک ہو گئی ہیں۔ جب ان عناصر کی تحلیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ اصل ان سب کی کچھ مفرد اجزاء ہیں نہایت چھوٹے، باریک ان کو "سالمات" اور "جوہر فردہ" کہا جاتا ہے۔ یہ نام ہے ان چھوٹے سے چھوٹے اجزاء کا جو کسی تدبیر سے قابل انقسام نہیں ہیں۔ یعنی ان کے ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے اور کسی طرح کی تقسیم نہیں ہو سکتی کیونکہ تقسیم خارجی کے دو طریقے ہیں ایک کاٹنا دوسرے توڑنا۔ توڑنے اور کاٹنے میں یہ فرق ہے کہ وہ آلہ جس کے ذریعہ سے ایک شے کو دو میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اگر نفوذ کرے اندر تو کاٹنا ہے اور اگر نفوذ نہ کرے تو توڑنا ہے۔ آپ نے قینچی لی اور کاغذ کو کاٹ دیا۔ تو کاغذ کے اندر یہ قینچی عبور کرتی ہے۔ اس کو آپ کاٹ کاٹنا۔ اور آپ نے مٹھوڑا لیکر سی شیشہ کو دو ٹکڑے کر دیا۔ یہ ہے توڑنا۔ اگر کوئی چیز اتنی چھوٹی ہو کہ گنجائش آلہ کی نفوذ نہ ہو تو کاٹنے کے قابل نہ ہوگی۔ اور اگر اتنی سخت ہو کہ چوٹ کا اس پر



اثر نہ ہو تو ٹوٹنے کے قابل نہ ہوگی۔ وہ سالمات کہ جن سے مادہ کی ترکیب مانی گئی ہے ایسے ہی ہیں کہ وہ چھوٹے اور سخت ہونے کی بنا پر نہ ٹوٹ سکتے ہیں اور نہ کٹ سکتے ہیں۔

اس تمام عالم عناصر میں جتنا بھی مادہ ہے۔ سب کے انتہائی مرکز پر سالمات ہیں۔ سابق زمانہ کے لوگ اس بات کے قائل تھے کہ سیارے خلا میں رہتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ تحقیق ہوا کہ خلا کا وجود عالم طبعی میں محال ہے اس لئے ضرورت ہے ایسے مادہ کے فرض کرنے کی جس میں یہ سالمات قائم رہیں۔ اس کا نام رکھا گیا "ایٹھر"۔ اس میں یہ سالمات اس طرح پیرنے ہیں کہ جس طرح سیارے فلک کے فضاؤں آسمان میں متحرک ہیں۔ جس طرح اُن کی حرکت کا منشا آج آج تک نہیں معلوم ہو سکا۔ اُسی طرح سے ان سالمات کی حرکت کا منشا نہیں ثابت ہو سکا۔ "ایٹھر" کیا ہے؟ آپ اس کو نہایت شفاف، ساف، لطیف اور خالص ہو سمجھ لیجئے۔ اس کو عربی میں "ایٹر" کہا جاتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے اندر تمام اجزاء مادی متحرک ہیں۔ اچھا یہ تو کتنا مادہ۔ "قوت" کس کا نام ہے؟ یہ قوت نام ہے اُس "حرکت" کا جو ان مادہ کے اجزاء میں پائی جاتی ہے۔ حرکت کی دوسری تعبیر حرارت سے کی جاتی ہے۔ کیونکہ حرارت و حرکت لازم و



مزدوم ہیں۔ آپ جب چلنے میں تو پسینہ نکلتا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ حرکت و حرارت۔

سابق زمانہ میں آگ پیدا کی گئی۔ وہ اسی طرح پیدا ہوئی کہ اجسام کا تضاد م ہوا۔ اور اس حرکت سے جو حرارت پیدا ہوئی اُس سے آگ ظاہر ہوئی۔ حقائق پھر یہاں اجاتا تھا تو آگ پیدا ہوتی تھی۔ اب بھی دیکھ لیجئے کہ دیاسلانی آپ گھر میں رکھے رہتے۔ لیکن وہ جلے گی نہیں جب تک ڈوبیا پر رگڑی نہ جائے۔ یہ حرکت ان اجزاء میں دو چیزوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ ایک جذب اور دوسرے دفع۔ "جذب" یعنی دوسرے جسم کو اپنی طرف کھینچنا۔ "دفع" یعنی دوسرے جسم کو اپنے سے دور کرنا۔ یہ لکڑی جو ہے اس کو آپ کاٹنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوت سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ قوت جذب کا نتیجہ ہے۔ جو اس کے اجزاء میں پانی جاتی ہو۔ جتنی قوت جذب زیادہ ہوگی اتنا ہی جدا کرنا دشوار ہوگا۔ لہذا ہر کے اجزاء میں سب سے زیادہ جذب ہر۔ لکڑی میں اُس سے کم ہے۔ اور جو معمولی چیزیں ہیں جو جلدی سے کٹ جاتی ہیں ان میں یہ قوت جذب بہت کم ہے۔ اسی کے ساتھ ہے قوت دفع۔ لکڑی کو آپ ہاتھ سے دبانا چاہتے ہیں تو اس دبانے میں جس طاقت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ قوت دفع ہے یعنی اُس کے اجزاء اپنے



مخالف کو دفع کرتے ہیں۔ جتنی زیادہ یہ قوت ہوگی۔ اتنی ہی صلاحیت اور  
 سختی پیدا ہوگی۔ رونی میں قوت دفع کمزور ہے اس لئے وہ پھولی ہوئی  
 آپ کے سامنے نظر آئیگی جتنا دباتے جائے دے گی۔ لیکن ایک حد  
 تک پہنچ کر پھر آپ کے دباؤ کو قبول نہ کرے گی۔ اس کا نام ہے قوت  
 دفع۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مادہ نے اجزاء میں قوت جذب و قوت  
 دفع کی بنا پر حرکت اور اس کے ساتھ اجتماع و افتراق پیدا ہوتا ہے  
 مادہ میں چار طرح کی چیزیں ہیں۔ حرکت۔ سکون۔ اجتماع۔ افتراق  
 اسی سے مختلف اقسام کی شکلیں بنتی ہیں۔

آپ ایک عمارت کو دیکھتے ہیں جو کئی منزلوں کی ہو۔ یہاں قوت جذب  
 مضبوط ہو رہی ہو ایک پر دوسرا درجہ بنا دوسرے پر تیسرا درجہ بنا دیا۔ یہ انسان  
 کے ارادہ و اختیار سے تھا۔ لیکن اگر پانی ہو جس میں نمک ملا ہوا ہو  
 پانی میں نمک گھول دیکھئے اور خوب اس کو ملا دیکھئے۔ اس کے بعد  
 اس کو رکھ دیکھئے۔ وہ نمک کے ذرے بیٹھا شروع ہونگے۔ ایک  
 مستقل صورت پر اور ایک مستقل ترکیب پر اس کی سطحیں قائم ہونگی  
 یہ نہ ہوگا کہ کہیں بلند ہو جائے۔ کہیں پست ہو جائے بلکہ بالکل  
 متوازن صورت پر وہ ذرے بیٹھے جائیں گے۔ یہاں تک  
 کہ ایک سطح برابر نمک کے ذروں کی بن جائے۔ اگر آپ اس کو



کسی فرد میں سے دیکھئے تو جس طرح حسین آباد کے سنگھنڈے میں ایک  
 طبق دوسرے پر ہے۔ اور جیسے ورق جوں اور وہ ایک دوسرے  
 پر پھیلنے لگے ہیں اسی طرح یہ نکل کی تہیں ہیں۔ یہ طبق کسی انسانی ہاتھ نے سبق قائم کئے ہیں۔  
 بلکہ وہی "قوت جذب" ہے جس کے نتیجہ میں یہ اجزائے ایک دوسرے  
 کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ چونکہ جو سب سے پہلے سطح تھی اُس نے ہر جہز  
 میں قوت جذب موجود تھی۔ یہ نہیں کہ بعض میں ہے اور بعض میں  
 نہیں ہے۔ ہر جہز میں رہا تھا اور ایک بورد دوسرا جزو آتا تھا اس لئے  
 سب کی ایک مساوی سطح قائم ہو جاتی ہے۔ اور بعض مقامات پر تو  
 یہ سطح بالکل خوبصورت سڈول ہوتی ہے۔ خصوصاً برف کی چٹانوں  
 کی۔ برف جہاں گرتی ہے وہاں کے لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ برف  
 پہاڑوں پر ایسی چکنی خوبصورت چمکدار چوٹیاں تیار کر دیتی ہے  
 معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے تراش کر اٹھیں بنایا ہے۔ لیکن کسی  
 نے ان کو تراشا نہیں ہے۔ بلکہ برف جو گرتی ہے وہ خاص ترتیب  
 سے آکر قائم ہو جاتی ہے۔ یہ نتیجہ اُسی قوت جذب کا ہے وہیں  
 قوت دفع بھی مصروف عمل رہتی ہے۔ جو چیز کہ اُس کی ذاتی  
 خصوصیتوں کے مخالف ہو۔ اس کو وہ دفع کرتی ہے یہاں تک  
 کہ خود آپ لوگوں میں۔ آپ کے خصوصیات صعبی میں یہ جذب دفع



کی طاقتوں کا افرمایا ہوتا ہے۔ مثلاً دو شخص آپ کے سامنے آتے ہیں۔ آپ نے ان کو کبھی دیکھا نہیں لیکن خواہ مخواہ ایک کی طرف میلان جمع پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسرے سے پہلی ہی نظر میں طبیعت متنفر ہو جاتی ہے جس کے ساتھ جتنے جلتے ہوئے آپس سے میلان ہوتا ہے جس سے اختلاف رکھنے ہیں اُس سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

آپ سیلاب کی زد میں پانی کی رفتار کو دیکھئے خصوصاً ایک دماغ جہاں یہ پانی گھٹ کر پھر باہر نکلتا ہے۔ وہاں اس کی طاقت کو دیکھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ وہاں وہ ایک اجتماعی شکل کے ساتھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ قوت جذب ہے جو ایک دوسرے کو باوجود اتنے اضطراب و تلام کے ملائے رکھتی ہے۔ اس جذبہ دفع کی طاقت نے مادہ کے اجزاء کو ملایا ہے اور متضادم کیا ہے اور ان کے اجتماع ہی سے مختلف خواص اور خاص صوۃیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ نخب چیز ہے ان مفردات عامہ ترکیبی میں کہ ہر ہر مفرد میں جو خاصہ نہیں ہے۔ ترکیب سے وہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں مثلاً۔ اور ان میں اشتعال نہیں ہے لیکن انہیں ملا دیا جائے تو اشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں دونوں کے اجتماع کا نتیجہ ہے۔



دو پتھروں کو اپنے رگڑا۔ اس سے آگ نکلی۔ یہ صودت ہے اُن  
 چیزوں کی جن کو آپ زندگی اور حیات کا عامل کہتے ہیں۔ اسی طرح  
 سے انسان جس وقت کسی چیز کا تصور کرتا ہے۔ کسی چیز کی طرف  
 اُس کا ذہن متوجہ ہوتا ہے تو اُس کے دماغ میں ایک ہیجان پیدا  
 ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ایک شعلہ جو اُٹھتا ہے اُس کا نام  
 ہے اور اک۔ درحقیقت یہ سب اسی مادہ کی کارستانیوں ہیں اور  
 یہ مادہ کے اجزاء ہیں جو آپس میں متصادم ہوتے ہیں۔ اس کے  
 علاوہ نہ کسی خالق کی ضرورت ہے نہ کسی موجد کی حاجت۔  
 یہ تھا مادّین کا نقطہ نظر جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا  
 لیکن ان مادّین سے جب ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ مادہ کے سالمات  
 کو تہ نے دیکھا ہے۔ تو صبر و سکون کے ساتھ اس بات کا اعتراف  
 کر لیا جاتا ہے کہ کوئی دور میں کوئی خود بین دنیا کی ایسی نہیں  
 ہے جو ان سالمات کے احساس میں ہمارے لئے کارآمد ثابت ہو  
 جتنی ذہنیں اب تک ایجاد ہو چکی ہیں۔ ایک ایک چیز کو ہزار ہزار  
 گنا دکھلانے والی۔ اُن سے ہم ایسے حیران کن دریافت کر سکتے ہیں  
 جو قابل انتظام ہیں۔ لیکن ایسے اجزاء جو قابل انتظام نہیں ہیں ہم کو  
 دکھلائی نہیں دیتے۔



چراغ جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مادہ کے سالمات کا ناقابل فنا ہونا بھی غلط ہے بلکہ وہ تضادم کے ذریعہ سے فنا ہو جاتے ہیں اور برقی لہروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان سالمات کا ناقابل تقسیم ہونا بھی غلط ثابت ہوا ہے بلکہ جدید زمانہ کی تحقیق میں اُن کو دو جزوئیت مرکب مانا گیا ہے جن میں سے ایک کو مثبت اور ایک کو منفی کہا جاتا ہے۔ فور کیا جائے تو پورا دار و مدار مادی مذہب کا حرکت پر ہے۔ لیکن یہ حرکت کیا ہے؟ وجود و عدم کا مجموعہ! حرکت غیر ثابت بے قرار، ایک سیال کیفیت رکھنے والی چیز ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کا کوئی جزو آ نہیں سکتا جب تک پہلا جزو رخصت نہ ہو جائے۔ جتنی چیزیں اس طرح کی ہیں اُن کا اجتماعی وجود ہمیشہ ایک موہوم حیثیت رکھتا ہے۔ کسی شے کی حرکت کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ ایک محل پر اس شے کا ہونا بعد اس کے کہ وہ اُس میں نہ تھی کیونکہ پہلا وہ دوسرے محل پر تھی۔ اگر وہ پہلے بھی اسی محل پر تھی تو حرکت نہ ثابت ہوگی۔ حرکت کا مفہوم اُسی وقت پیدا ہوگا جب اُس کا عدم اس نقطہ پر مانا جائے اور پھر وجود کا تصور



کیا جائے۔ اسی سے حرکت کے مفہوم کی تشکیل ہوتی ہے۔ جتنی چیز دنیا  
 میں اس حرکت کا جزو و شریک ہے اُن میں بے ثباتی موجود ہے جیسے  
 میرا کلام، جب پہلی لفظ دین سے نکلنے کے بعد ختم نہ ہو جائے اُس وقت  
 تک دوسری لفظ آ نہیں سکتی بلکہ ایک ہی لفظ میں جب تک پہلا  
 حرف جگر قالی نہ کر دے اُس وقت تک دوسرا حرف آ نہیں  
 سکتا۔ ایک سیلابی عالم اور ایکے واں حالت ہے معلوم ہوا کہ جب تک  
 دنیا میں حرکت قائم ہے اُسے پابند و دآپ مان نہیں سکتے بلکہ اُس کے  
 ہر وجود میں عدم کا پہلو شریک رہے گا۔ ہستی محض نہ ہوگی نیستی  
 اُس کے ساتھ پہلو نشین ہوگی۔ پھر اس کائنات کی کون سی چیز  
 ایسی ہو سکے گی کہ اُس میں وجود ہی وجود ہوا و عدم کی گنجائش نہ ہو  
 دھبی آپ مادہ کہتے ہیں ایک تڑپتی ہوئی ہستی رکھنے والی چیز اور ایک  
 مضطرب وجود ہے اُس کی توشان یہ ہے کہ بغیر کسی خاص صورت کے اُس کا  
 وجود قائم ہی نہیں ہو سکتا یعنی غیر ممکن ہے کہ کوئی مادہ بغیر صورت کے حاصل ہو  
 اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ محتاج ہے مادہ کا۔ اور حرکت مادہ کوئی ایک چیز نہیں ہے  
 جسے موجود کہا جاسکے چہ جائیکہ قدیم بلکہ اُس کا ہر جزو ایک مستقل حادثہ ہے  
 اور وہ خود مجموعہ ہے ایک سلسلہ حوادث کا۔ ایک سلسلہ ہی  
 وجود و عدم۔ اور عدوت و فنا کا جو برابر چل رہا ہے اس کا نام ہے حرکت



صرف اتنا ہی نہیں کہ ہر جذبہ کے ساتھ ہر کام کا ہر شریک ہو بلکہ اس کے ہر جذبہ کی علت  
 نیستی ہی یعنی سابق جذبہ کا عدم باعث ہوتا ہے، اپنے مابعد کے وجود کا کیونکہ جب تک  
 جذبہ معدوم نہ ہو دوسرا جذبہ موجود نہ ہو سکے گا۔ اب یہ سلسلہ تنہا ہی جودانی سہی ممکن  
 عقل تو بڑی وسیع چیز ہے وہی ان چیزوں کو جو سلسلہ شاہد ہے بلندی تصور کے ساتھ  
 جمیع کر کے اپنے سامنے لاتی ہے اور ان پر حکم لگاتی ہے۔ یہاں پر بھی عقل میں بڑی  
 حرکت کو ایک مجموعہ کی صورت میں تصور کرتی ہے اور جب اس مجموعہ کی حقیقت پر  
 غور کرتی ہے تو وہ حکم لگاتی ہے کہ جب تک اس کے ماقبل کا عدم فرض نہ کیا  
 جائے اس وقت تک مجموعہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ مفہوم جس چیز کو تقاضی ہوا اس وقت تک  
 الگ کیسے ہو گا۔ ہم تو ڈھونڈ رہے تھے اس دنیا کے کائنات میں ایسی چیز جو ذاتاً وجود کی تقاضی  
 ہو یہاں معاملہ عکس نظر آتا ہے یعنی اس دنیا کے کائنات کی ذات اپنے ماقبل عدم کی  
 تقاضی ہر جبکہ وہی فرض کی جائے اس وقت تک یہ سلسلہ شروع ہی نہیں ہوتا۔ آگے تو بعد کو  
 بڑھ گیا۔ اب تک کہ وجود ہر شے کا سبب طالع ہے اس لئے وجود کا سبب تو نیستی کو قرار دینے کو  
 اس کے آگے ہر یا کچھ ہی وجود کو مانے جو اس نیستی کی شرکت الگ ہو یہ ظاہر ہے کہ نیستی  
 شرط کسی شے کے وجود کی ہوتی ہے لیکن مستقل سبب کا ہرگز نہیں ہو سکتی نیستی ہی ہے۔  
 جب تک کسی شے میں خود وجود نہ ہو۔ وجود ہی کیسے ہو سکتی ہے اس لئے نیستی ہی کی علت قرار  
 نہیں ہو سکتی لہذا ضروری ہے کہ ایک ایسا وجود مانے جو اس نیستی کی پیشتر ہی باہر ہو۔ وہی اس حرکت کا  
 پیدا کرنے والا ہو وہی اس نظام کا قائم کرنے والا۔ اسی کا نام واجب الوجود ہے۔



پھر اس پر غور کیجئے کہ کسی شے کی طبیعت کا تقاضہ بدل نہیں  
 سکتا۔ یعنی جو جس شے کی طبیعت کا خاصہ ہے اس میں اختلاف  
 نہیں پیدا ہو سکتا۔ ایک طبیعت کی مابیت اور حقیقت اور اس کا  
 خاصہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ تو ہم عالم ازل سے فرض کرتے ہو گئے  
 نقطہ۔ اگر مادہ کے اجزاء کچھ ہیں سے موجود ہونے ہوئے اور کچھ بعد  
 تو میں کہتا کہ کچھ مادہ کے اجزاء جن کو دس برس گزرے۔ اُن کی  
 طبیعت کا خاصہ ایک ہی۔ اور جن کو بیس برس گزرے اُن کی  
 طبیعت کا خاصہ اور۔ اس سورت میں جزا مادہ کی طبیعت اور  
 خواص میں اختلاف ممکن تھا۔ لیکن چونکہ یہ ہیں ازل ہی ہم اس میں  
 جزا اور زمانہ کی تفریق نہیں کر سکتے۔ اب یہی نقطہ یہ اس کے  
 اجزاء کا خاصہ کیا تھا؟ یعنی ان حرکتوں کے ذریعہ سے کس طرح کی  
 مخلوق ہونا چاہئے تھی۔ یقیناً وہ ایک ہی شے ہوتی ہے تو پھر  
 ہر ہر ذرہ میں یعنی ہمارے مشرق سے مغرب تک سب جتنے اجزاء ہیں  
 اُن کی طبیعت کا خاصہ ایک ہی ہونا چاہئے تھا۔ اور ایک ہی طبع  
 کی مخلوق ہونا چاہئے۔ یہ بہرہ دستی نہیں ہے عقل میں آنے کی  
 بات ہو تو مانئے۔ مثلاً یہ پانی فرض کیجئے۔ اس کی طبیعت کا  
 تقاضا ہے کہ دس منٹ تک آگ کے اوپر رکھا رہے تو گرم



ہو جائے پھر دس منٹ رکھا رہے تو بالکل کھولنے کے پھر دس منٹ  
 میں جوش آجائے اور اُبلنے لگے۔ اس میں پانی کے اجزاء کے اندر تفریق  
 ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اُس کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ پھر اگر اس مادہ  
 کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتی جیسے آگ کے تو ممکن تھا کہ یہ آگ جن  
 اجزاء سے قریب ہے۔ اُن میں کچھ اثر پیدا ہو اور جن سے یہ دور  
 ہے اُن میں کچھ اثر پیدا ہو۔ جیسے فرض کیجئے کھڑی پکائی۔ چاول  
 آدھے کچے رہ گئے۔ بھاپ نہیں بھونچی۔ لیکن یہاں تو یہ فرض کیا  
 تھا ہے کہ شروع میں اُس مادہ کے ذرات تھے۔ اور اُن میں قوت  
 تھی اور اس کے آگے کچھ تھا ہی نہیں۔ جب کچھ نہیں تھا۔ اور مادہ  
 تمام عام میں بھیلنا ہوا تھا۔ تو جو اس کی طبیعت کا تقاضا ہوا اسے  
 ہمہ گیر صورت پر پیدا ہونا چاہئے۔ مثلاً ابتدائی منزل میں مادہ  
 کی طبیعت کا تقاضا ہے جماد تو شروع میں پتھری پتھر ہونا چاہئیں  
 وہ بھی ایک خاص رنگ خاص طبیعت کے چرچہ ایک لاکھ برس مثلاً  
 اور گزریں تو چونکہ بس وہی اجزاء ہیں اور ان میں طبعی تقاضے سے  
 انقلاب ہو رہا ہے تو اب مثلاً سب پتھر فنا ہو کر رخت بن جائیں۔  
 تمام کائنات میں دشت ہی دشت نظر آنے لگیں۔ جس وقت میں  
 یہ دور بھی منقضی ہو اُس وقت اُبال اُس مادہ کا اس دور پر



پہونچے کہ حیوانات نمایاں شروع ہوں اور پھر ان کے بعد ایک وقت  
 ایسا آئے کہ انسان ہی انسان دنیا میں ہو جائیں۔ لیکن ہم دیکھتے  
 ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ مادہ وہی ہے۔ اُس کے ذرات وہی ہیں لیکن  
 کائنات بالکل مختلف ظاہر ہو رہی ہے۔ نہیں پھر نمودار ہوتے ہیں  
 کسی درخت اور حیوان اور کہیں انسان۔ بغیر  
 آثار اور خواص بتہ دیتا ہے کہ یہ غیر اختیاری خاصہ طبیعت نہیں تھا  
 بلکہ کسی کاتب کا بنایا ہوا نقش ہے۔ جہاں جو نقطہ رکھ دیا وہی  
 وہاں نظر آتا ہے۔ ہم نے مانا کہ یہ مادہ اس کے لئے روشنائی کا  
 کام دیتا ہے۔ مگر یہ صرف روشنائی کا کام نہیں ہے کہ مختلف  
 نقوش تیار ہو جائیں۔ بلکہ کسی کاتب کا قلم ساتھ چلتا ہے جو  
 قدرت و اختیار کے ساتھ ہر جزو کو اُس کے محل پر رکھتا ہے۔  
 آپ نے نمک کے ذرات کی مثال دے دی کہ وہ مٹھتا ہے تو  
 مستوی سطح کی صورت میں قائم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قوت جذبہ سیابی  
 طور پر کام کرتی ہے لیکن بغیر کسی خارجی سبب کے یہ غیر ممکن ہے کہ  
 کسی ایک طرف وہ زیادہ جمع ہو اور کسی دوسری طرف کم۔ یا ایک  
 طرف وہ مدور شکل بنا دے اور دوسری طرف مثلث۔ کہیں بلند  
 ہو جائے اور کہیں پست۔ اس کے علاوہ خواہ یہ نمک ہو جو متساوی



سطح کی صورت میں بیٹھتا ہے یا وہ فوارہ سے نکلتا ہوا پانی ہو۔  
 بے شک کوئی نہ کوئی مقدار ہوگی۔ کیونکہ مقدار تو ہر جسم میں ضروری ہو۔  
 لیکن کیا وہ بیٹھنے والا تک اس کا بھی ذمہ دار ہوگا کہ آپ کو جس طرح کی  
 صورت کی ضرورت ہو اُس طرح سے بیٹھے۔ ہندسی شکل کے مطابق  
 تو ہوگا۔ لیکن اغراض و فوائد کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔  
 آپ جس وقت جہاز پر سفر کریں تو ملاحظہ کریں کہ جہاز کے چلنے کی وجہ  
 سے سمندر میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ دور دور تک معلوم ہوتا ہے  
 کہ اُٹھتی ہوئی موجیں آپس میں ٹکرائی ہوئی جاتی ہیں اور تھوڑی دور  
 پر ایک ٹیلا بنا دیتی ہیں پانی کا۔ آپ اس کو دیکھئے تو عجیب سحر  
 اور جھکار کا عالم نظر آئیگا۔ مگر یہ نہیں ہے کہ یہ موجیں یہ دیکھ کر  
 جائیں کہ ہمیں کس طرح اُٹھنے کی ضرورت ہے ہمارے جانے سے  
 کیا فائدہ مرتب ہوگا۔ اس میں اغراض و فوائد مرتب نہیں ہو سکتے  
 یہ نتیجہ ہے طبعی حرکت کا نہ کہ ارادی حرکت کا۔ لیکن ان سیدھی اور  
 تیز موجوں میں مقصد کا کاغذ بھی مضمر ہو سکے۔ یہ حرکت طبعی ہیں  
 نہیں ہو سکتا۔ اہلک و ارادہ میں ممکن ہے۔ کیونکہ اہلک و ارادہ  
 وہ چیز ہوتی ہے جو مقصد و غرض کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے اور  
 اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک شخص گرتا ہے اور ایک بچا نڈتا ہے جو کوئی



پہرے پھاندے گا۔ اگر خود کشی منظور نہ ہو تو وہ دیکھ بھال کر اس طرح پھاندے گا کہ کوئی ضرب نہ آئے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی نگاہ یا اندازہ ٹھٹھی کرے۔ مگر پیش نظر وہ اس کو رکھے گا۔ لیکن جو شخص بے اختیاری طور پر گرے گا وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ کس طرح گروں۔ یہ کیا ہے یہی کہ وہ حرکت طبعی ہے اور یہ ارادی ہے۔ قلم کاتب کا جو کتابت کرتا ہے تو وہ یہ کاٹھ کرتا ہے کہ مجھے کس طرح چلنا چاہئے اور مرتضیٰ کا ہاتھ جو حرکت کرتا ہے اُسے یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے کس طرح حرکت کرنا مناسب ہے۔

طبعی خواص سے بے شک شکلیں بنتی ہیں لیکن اغراض و مقاصد کا کاٹھ غیر ممکن ہے۔ پھر اگر تمام عالم کائنات اس طرح پر ہوتا جیسے رینگ کا تو وہ بے نتیجہ ہوتا ہے تو ہم مان لینے کہ یہ صورت اس مادی قوت جذب و دفع کا نتیجہ ہے۔ لیکن جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کی تخلیق میں مقصد کا کاٹھ ہے۔ نباتات اگر ہیں تو نباتات میں اُن کی مناسب رنگ و ریشہ ہوتا ہے حیوانات میں اُن کے کاٹھ سے عروق و شرائین ہیں۔ جس شے کی دنیا میں زیادہ ضرورت ہے وہ زیادہ پیدا کی گئی ہے



جس کی کم ضرورت ہے کم پیدا ہو گئی ہے۔ پانی چونکہ زیادہ ضروری تھا۔ اس لئے بہت زیادہ خلق کیا گیا۔ زمین پر پانی زمین کے نیچے پانی ہوا چونکہ ہر ذی حیات کے لئے زیادہ ضروری تھی اس لئے اس سے بھی زیادہ پیدا کی گئی۔ سونا۔ چاندی۔ جواہرات۔ چونکہ ان کی ضرورت کم تھی کم پیدا کئے گئے۔ اسی طرح سیکڑوں نفریقہیں دنیا میں قائم ہیں۔ اور سب اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ہیں۔ ارادہ و اختیار کے بغیر ان کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی پھر جن چیزوں میں حیات پائی جاتی ہے وہ حیات تو ہرگز مادہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ آپ کا یہ کہنا کہ حیات بھی نتیجہ ہے ان مادی چیزوں کے اجتماع کا۔ اسی اجتماع سے ایک وقت میں حیات پیدا ہوتی ہے۔ اس کی مثال یہ دینے ہیں کہ بہت سی چیزیں جو مستغن ہو جاتی ہیں ان میں کپڑے پڑ جاتے ہیں۔ یہ کپڑے غیر ذی حیات چیز سے پیدا ہوئے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ آج کل یہ تحقیق ہو گیا ہے کہ وہ کپڑے جو ہوتے ہیں وہ بھی عام ذی حیات چیزوں ہی کی طرح سے پیدا ہوتے ہیں اور نالیوں وغیرہ کے ذریعے سے باہر آ جاتے ہیں۔ جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں غیر ذی حیات مادے الگ ہیں اور ذی حیات چیزوں کا



مبدأ الگ ہے۔ یہ حیات کہیں کہیں مخفی رہتی ہے۔ مثلاً انڈیا  
 ہماری نظروں میں ایک جادو چیر ہے۔ مگر تحقیق سے معلوم ہو گیا  
 ہے کہ یہ خود ذکیات ہے۔ اس میں وہ اثر حیات کے مضمر ہوتے  
 ہیں اور یہی وہ ہوتا ہے جو منتقل ہوتا ہے اُس بچہ کی طرف جو  
 پیدا ہوتا ہے۔ کہیں پر ذی حیات غیر ذکیات سے نہیں ہوتا  
 بلکہ ذکیات ہی سے ذکیات پیدا ہوتا ہے

اب اگر تاریخ ساتھ دے تو مادی نقطہ نظر سے تین مادے  
 مان لئے جائیں۔ مادہ۔ قوت۔ حیات۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ  
 ذکیات چیز کو تاریخ بتلاتی ہے کہ وہ پہلے بالکل نیست تھی اب  
 ہست ہوئی ہے۔ اس بنا پر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مادہ تو  
 تھا ہی۔ یہ حیات مادہ میں کہاں سے آئی۔ اور جب وہ کلیہ  
 پیش نظر رکھ لیا جائے کہ کوئی چیز نیست ہست نہیں ہو سکتی  
 عدم سے وجود کہیں پیدا نہیں ہوتا تو جس طرح سے مادہ مادہ  
 کے لئے مبدأ قرار پاتا ہے اس لئے ازلی چیز ہے۔ اسی طرح  
 آپ کو ذکیات اشیاء کے وجود کے لئے ایک سرچشمہ حیات تسلیم  
 کرنا پڑے گا۔ اور اُسے ازلی ماننا پڑے گا۔ اُسے ابدی ماننا پڑے گا  
 اور اُسے غیر قابل زوال ماننا پڑے گا۔



پھر فی شعور چرس علم و ادراک یہ بھی مادی نقطہ نظر سے قابل  
تبیہ نہیں ہے۔ یہ کتنا کہ جیسے دو پتھروں کے رگڑنے سے شعلہ پیدا  
ہوا ویسے ہی ادراک ہے۔ یہ بھی خاصہ ہے۔ میں کہو گھا کہ اگر ادراک  
اسی چیز کا نام ہے تو جس شے کا ادراک ہو وہ تو معلوم ہونا چاہئے  
مگر خود ادراک کا ادراک نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ ادراک ایک  
طبعی خاصہ ہے اور اس طبعی خاصہ کا نتیجہ ہے اس کے بعد  
کی منزل یعنی جس شے پر روشنی پڑے وہ منکشف ہو جائے۔  
لیکن خود یہ ادراک۔ اس کا ادراک ہونا چاہئے کیونکہ یہ طبعی خاصہ  
ہے اور طبعی خاصہ ماتحت شعور نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ وجدانِ باری  
یعنی خود اپنا احساس، اپنے کیفیات و واردات قلبی کا احساس  
یہ ایسی چیز ہے جو مستقل طور پر انسان میں موجود ہے اور یہ کسی  
طرح طبعی خواص پر منطبق نہیں ہوتا۔

## حیات اجسام کا سرغامرض

ڈاکٹر یعقوب صروف، مصر کے اکابر فلاسفہ و محققین میں سے  
تھے۔ ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں جو  
مصر کے مجلہ "المعتطف" میں شائع ہوئی ہے اس مسئلہ پر تبصرہ



کیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہاں عرض کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں،۔  
 کیمیاوی بکثرت و غلیظ کے بعد خیال قائم کیا گیا ہے کہ حیوان  
 نبات و جماد نیوں قسم کے اجسام ایسے جامد اور لاشعور ذات سے  
 مرکب ہیں جن میں ذاتا حیات و حرکت کا فقدان ہے اور کسی کیمیاوی  
 طریقہ سے اُن کا تجزیہ ممکن نہیں ہے اسی لئے انہیں بسیط کہا جاتا  
 ہے لیکن اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ذرات  
 اپنی ذاتی حیثیت سے حیات و حرکت ارادہ سے محروم ہیں تو نبات  
 میں حیات اور حیوان میں اس کے ساتھ ساتھ حرکت ارادہ کہاں سے  
 پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً گہیوں کی اصل فطرت میں ایک مادہ حیات موجود  
 ہے کہ جب اُس کو مناسب زمین میں بوجا جائے اور خارجی حالات  
 بھی موافق ہوں تو وہ مادہ حیات اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے  
 اور رفتہ رفتہ وہ حیات معرض فعلیت میں آکر گہیوں کے دانوں  
 میں سرایت کر جاتی ہے اور تھوڑے دنوں میں نمودن و تراشد کے برکات  
 سے خاک کے پردہ کو چاک کرتی ہوئی بالیوں کی صورت میں ظاہر  
 ہو کر ایک وسیع پیمانہ پر بنی نوع بشری کے رزق کا سامان مہیا کرتی  
 ہے لیکن وہ گہیوں جن کو بویا گیا ہے اگر از اول ایسے ہوں کہ جن میں  
 طویل مدت گزرنے کے سبب قوت حیات فنا ہو چکی ہے تو لاکھ



قوت جاذبہ اطراف و جوانب سے رطوبت کو جذب کرے لیکن کبھی ان میں نمو و تزاید پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح ایک تازہ انڈے کو روٹی کے پہلوں کے اندر ایک خاص مدت تک رکھا جائے تو وہ کمزور مخلوق جو ان میں ضمیر ہے اپنی قوت حیات کے باعث نمو پیدا کر کے کچھ سی دلوں میں گوشت و پوست اور پردہ بال سے آراستہ ہو کر ایک صحیح و سالم طائر کی صورت میں اپنی کال کو ٹھری سے نکل کر ماں باپ کے پیچھے دوڑنے لگے گا۔ لیکن اسی انڈے کو کچھ زمانہ تک اگر چھلی جگہ پر ڈال دیا جائے وہاں تک کہ وہ مادہ حیات جو اس کے اندر ہے فنا ہو جائے تو پھر لاکھ کوششیں صرف کی جائیں کبھی اس میں ایک طائر پیدا نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ قوت زندگی کہاں سے آتی ہے اور حیات کا بھید کیا ہے اور نمو اور تزاید کن اسباب کا نتیجہ ہے؟

ڈاکٹر یعقوب صروف جن کے ساتھ اس تقریر کے موقع پر دواؤں کا کافی ذخیرہ موجود تھا انھوں نے کہا:-

دیکھئے! کر بون ایک بسیط عضو ہے جس کی مختلف شکلیں ہیں جن میں سے مشہور کوئلہ ہے اور یہ سب کاسیجن میں حل جاتا ہے (ہاتھ میں ایک کوئلہ لیکر) یہ ایک ٹکڑا ہے اس کوئلہ کا جو بالکل جامد اور سیاہ کاسیجن ایک لطیف عنصر ہے ہوا کی صورت میں میرے ہاتھ میں جو



دو شیشے ہیں۔ اُن میں ایک میں ہوا بھری ہوئی ہے اور دوسرے شیشہ میں آکسیجن ہے۔ ظاہری صورت میں یہ دونوں یکساں ہیں اور کوئی فرق نہیں لیکن خواص کی حیثیت سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے جیسا کہ ذیل کے اکتشافات سے آپ کو معلوم ہو گا۔ یہ لکھنؤ میں نے ایک شمع روشن کی۔ اور اُس کو ایک شیشہ کے اندر جو ہوا سے مملو تھا داخل کیا، اُس کی روشنی دھیمی پڑ گئی اور ذرا دیر میں بجھ گئی۔ اُس کے متعلق تھوڑی سی تقریر کرنے کے بعد دوبارہ شمع روشن کی اور اُس کو دوسرے شیشہ میں داخل کیا کہ جس میں آکسیجن بھرا ہوا تھا۔ اُس شمع کی روشنی زیادہ ہو گئی اور تو بڑھ گئی اُس کے بعد آگ کو تیل کے ٹکڑے میں اپنے سامنے کے چراغ سے آگ دینا چاہی۔ شکل سے ایک گوبہ میں اُس کے ذرا آگ لگی لیکن چراغ سے دھواں بھلے کے بعد وہ آگ قریب تھا بجھ جائے۔ فوراً اُس کو آکسیجن سے شیشہ کے اندر داخل کیا۔ اُس میں سے تھلے بھلے گئے۔ اور نمایاں روشنی ظاہر ہوئی تیسری بار تھوڑی سی روٹی ایک آنی سا چراغ میں پیٹ کر آگ سے روشن کی اور آکسیجن کی بوتل میں اُس کو داخل کیا۔ دفعۃً اُس کی روشنی زیادہ ہو گئی۔

ان تجربوں کے واضح طور پر بیان کر کے بعد کہنا کہ آپ حضرات کو



معلوم ہو گیا ہو گا کہ آئین میں ذاتی طور پر خاصہ ہے کہ وہ آگ سے روشن اجسام کو قوت پہونچا کر ان کی روشنی اور اشتعال کو زیادہ کر دے، اگر موقع ہوتا تو میں آپ کے سامنے واضح کر دیتا کہ آئین اکثر دیگر اجسام کے جلانے کی بھی قوت رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ بذات خود بار دہوں۔ ہیڈروجن بھی مثل آئین کے شفاف عنصر ہے لیکن اُس سے زیادہ سبک ہے۔ اور اُس کے خواص میں سے یہ ہے کہ آئین کے ساتھ متحد ہونے کے بعد ان دونوں سے پانی پیدا ہو جاتا ہے، دنیا میں جتنا پانی ہے خواہ وہ دریا میں ہو یا کنودوں کے اندر یا ابر کے دامن میں ضرور ان دونوں سے مرکب ہے۔ چوتھا عنصر نئیروجن۔ یہ بھی سابق دونوں کے مثل شفاف اور لطیف ہے لیکن اس کے خواص اور آثار ان دونوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ آئین کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے اور ان دونوں کے اتحاد سے سخت ترین تیزاب تیار ہوتا ہے جن میں سب سے زیادہ شدید تیزاب ہے جو چاندی اور اکثر معادن کو کھلا دیتا ہے اور جاندار اشیاء سے قوت حیات کو فنا کر دیتا ہے۔

سابق کے بیانات سے معلوم ہو چکا ہے کہ زحیات اجسام کے جو اشیاء ان ہی چار عنصروں سے مرکب ہیں۔ لیکن جب ان عناصر کے خواص و آثار پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہی مرتبہ آئین



ہیڈوجن کے ساتھ متحد و مخلوط ہو جائے تو اُس سے صرف پانی پیدا ہو سکتا ہے اور اس صورت میں نٹروجن اور کربون بالکل بے تاثیر رہ جائیں گے۔ اور اگر کربون آکسیجن کے ساتھ متحد ہو جائے تو اس میں بالکل جل کر ایک خاص قسم کے زہر کی صورت اختیار کر لے گا، اسی طرح اگر کربون اور ہیڈوجن میں اتحاد پیدا ہو جائے تو ایک جل اٹھنے کے قابل مادہ اُس سے تیار ہو گا اور اگر کسی نٹروجن اور آکسیجن میں اتحاد ہو گیا تو ایک سخت ترین تیزاب موجود ہو سکے گا۔ اب اگر ان چاروں عناصر کو متحد کر دیا جائے تب بھی مذکورہ بالا اشیاء کے سوا کسی چیز کا حاصل ہو جانا ناممکن ہے۔ پانی ہو یا زہریلا گیس یا قابل اشتعال مادہ یا تیزاب۔ یہ سب روح حیات سے معرا ہیں اور اُن میں زندگی کا پتہ نہیں بلکہ اکثر ان میں سے زندگی کے دشمن اور اُس کو فنا کرنے والے ہیں۔ پھر کون وہ مہستی ہے جو قانون طبیعت کی مخالفت کرتے ہوئے ان چاروں عناصر کو ترکیب دیکر ایک ذی حیات شے کو موجود کر دیتی ہے اور ہمیشہ اُس کے نظام ترکیبی کی نگہداشت کرتے ہوئے اُس کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے روکتی رہتی ہے کہ جس کے سبب اُس کی ترکیب میں خلل نہیں واقع ہوتا اور جو اصول مقرر کر دیا گیا ہے اُس سے یکسر بوجہ تجاوز نہیں ہوتا اور کون وہ ہے جس نے



ان ذرات کو اتنی قوت عطا کر دی ہے کہ وہ نبات میں نبات، طائروں میں طائر، انسان میں انسان کی تخلیق کر سکیں اور کون اُن کے اعمال کی نگہداشت کرتا ہے کہ کبھی اُس میں غلطی نہیں ہوتی جبکہ فلسفہ نے طے کر دیا ہے کہ یہ ذرات ذراتِ مائیکساں ہیں۔ اور اُن کی ترکیب بھی تمام اقسامِ حیوان و نبات میں ایک ہی طرح پر ہے۔ پھر اگر ارادہ و غذا و اس نظام میں تفریق کا ذمہ دار نہ ہو تو جسم کے ذرات کو کون روک سکتا ہے اس سے کہ وہ صرف گوشت کی تکوین کریں۔ اُس وقت پورا جسم گوشت کا بن جائیگا کہ جس میں ہڈی کا پتہ نہیں یا صرف ہڈی کی خلقت ہو کہ تمام جسم صرف ہڈی کا بن جائے جس میں گوشت کا نشان نہ ہو یا صرف خون پیدا ہو اور پورا جسم ایک خون کا ٹکڑا بن جائے جو کچھ ہی دن بعد مستغن ہو کر در در کے لوگوں کو اذیت پہنچانے لگے کیونکہ فلسفی تحقیقات نے ان جراثیم کے طبعی خصوصیات کو متحد بتایا ہے پھر اُن کے تاثیرات میں گونا گوں اختلاف کیا معنی رکھتا ہے۔ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ پورا نظام ایک مقتدر مصلحت میں خالق کے ہاتھ میں جو تمام عناصر و جراثیم کو اپنے ارادہ کے مطابق ترکیب دیتا، حرکت میں لاتا اور موجود بناتا ہے۔

حیات اجسام کا مسئلہ اتنا فاسد ہے جہاں عقل ششدر اور



حیران رہ جاتی ہے۔ یہ اجسام کہ جن میں حیات و ارادہ یا تنہا حیات و دلیت رکھی گئی ہے کیمیاوی ذرائع سے ان کی تحلیل کر ڈالنے اور موجودہ فلسفہ عملیات کے تمام بہترین آلات سے اُن کے شیرازہ کو منتشر کر دیجئے تو چاروں عنصر بسیط ہو کر علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے مگر وہ حیات کہ جو اس مجموعہ میں پائی جاتی تھی مفقود ہو جائیگی اور یہ عناصر مثل دیگر جمادات کے بے حس اور جامد ہو جائیں گے۔ پھر اگر دنیا کے تمام ذرائع صرف کر دیے جائیں اس کوشش میں کہ یہ عناصر جس طرح پہلے تھے اُسی طرح دوبارہ ترکیب دیدئے جائیں تو یہ امر دشوار بلکہ محال ہے۔ عناصر سب موجود ہیں مگر وہ حیات کہ جو ان میں مضمر تھی تحلیل کے بعد بالکل مفقود ہو گئی اور اس کا نشان تک بھی معلوم نہ ہوتا اور نہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ان میں کس طرح قائم تھی اور اب کہاں چلی گئی۔

کیمیاوی آلات و ذرائع یہاں پہونچکر ساتھ چھوڑ دیئے ہیں اور سپر انداختہ ہو کر شکست کا اعتراف کرتے ہیں۔ اب انسان مجبور ہو کر دوسرے قسم کے اسباب تحقیق کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس راز کے معلوم کرنے کے لئے (فدہ میں) چھوٹی چیزوں کو بڑا کر کے دکھانے والے آلہ سے بہتر کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ وہ آلہ ہے



جس کے ذریعہ سے موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے شکل ترین مسابلی  
 فلسفہ طبیعیات کے حل کر دیے گئے ہیں اور وہ اسرار و خواص غیبیہ  
 کئے گئے ہیں جن تک فکر انسانی پہنچنے سے قاصر تھی۔ اس آلہ کی  
 صنعت اس کمال کی حد تک پہنچی ہے کہ ایک چھوٹی سے چھوٹی  
 چیز ہزار ہزار درجہ بڑی ہو کر نظر آنے لگتی ہے۔ یقیناً حکماء طبیعیات  
 کے لئے اس سے بڑھ کر راز حیات کے دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ  
 نہیں ہے۔ اُن کو مجبور ہو کر اس کے دامن میں پناہ لینا پڑی تو یہ  
 نتیجہ نکلا کہ ان تمام اجسام کے اندر جن میں حیات و ولایت رکھی  
 گئی ہے ایسے چھوٹے چھوٹے کیرے موجود ہیں جو انتہائی باریک  
 شفاف اور رنگ سے خالی ہیں۔ لیکن طاقتور ترین آلات  
 کبیرہ سے طویل زمانہ تک غور کے بعد بھی ان کیروں میں اعضاء  
 نظر نہیں آئے اور نہ ان کی شکل تمام اقسام نبات و حیوان میں یکساں  
 دکھلائی دی۔ ہاں یہ دیکھا گیا کہ یہ کیرے برابر متحرک ہیں اور  
 ایک خطہ بھی ساکن نہیں ہوتے اور مستقل طور پر خارجی فیرو حیات  
 عناصر کا استفادہ کر کے اُن کو ایسے محرک عقول طریقہ سے دیکھات  
 بنا دیتے ہیں جس کا آج تک طبی دنیا کو انکشاف نہ ہو سکا۔ پھر ان  
 سے باریک خطہ ط اعضاء شریان یا استخوان یا عضلات کی



صورت میں پیدا ہو کر ایک جال اعصاب و شرائین وغیرہ کا پھیل جاتا ہے  
 لیکن اس صورت سے کہ جو کیرے استخوان بنانے کا کام کر رہے ہیں  
 وہ اعصاب کی طرف رخ نہ کریں گے اور اسی طرح جو جراثیم درخت  
 میں برگ کی ایجاد کرنے والے ہیں کبھی غریبی صورت نہیں پیدا کرتے  
 اور اسی پر تمام اجزاء نبات کا قیاس کرنا چاہئے۔ لیکن حیرت کی  
 اس وقت انتہا نہیں رہتی جب علمی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ  
 برگ، دگل، شاخ و ثمر اور حیوانات میں گوشت و پوست و شرائین  
 و عروق کے مادی اجزاء تمام اقسام نباتات و حیوانات میں یکساں  
 ہیں اور حیات کے ہر دور میں یکساں طور پر باقی رہتے ہیں اور  
 اکثر جو خارجی غذا ان مواد تک پہنچتی ہے وہ بھی متحد ہے مگر باوجود  
 اس کے عجیب نظام قائم ہے کہ بعض ذرات دوسرے ذرات  
 کے عمل میں کوئی مزاحمت و دخل اندازی نہیں کرتے اور تقسیم عمل  
 کے کام کو ایک منظم قانون کے ماتحت انجام دے رہے ہیں جس کے  
 نتیجہ میں ایک پورا درخت یا حیوان پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر جب یہ  
 کیرے اعضا کی خلقت کو تمام کر دیتے ہیں تو ان کو چھوڑ کر علیحدہ  
 نہیں ہو جاتے بلکہ خود مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر گوشت و پوست  
 اور برگ و ثمر میں منتشر ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جسم کے



ہر جہ میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور کوئی حصہ جسم کا اگر چہ وہ  
 اُس کا ہزاروں جزو کیوں نہ ہو ان سے خالی نہیں ہے۔ اور  
 یہ امر بھی یقینی ہو کہ ان کیٹروں کی پیدائش بھی اصل میں کچھذحیات  
 کیٹروں سے ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام کیٹروں  
 میں حیات کہاں سے آتی ہے۔ اور اُس پاس کے غیر ذی حیات  
 مواد پر یہ حیات کا فیضان کس طرح کرتے ہیں اور کس اصول کی  
 بناء پر یہ بعد میں کثیر حصوں میں منقسم ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں  
 اور کس عنوان سے پوری باریک بینی اور امتیاز کے ساتھ تقسیم عمل  
 کے فرض کو انجام دے کر مختلف النوع اجزائے بدن کی تشکیل  
 میں حصہ لیتے ہیں۔ باوجودیکہ اُن کی حقیقت ماہیت اور خواص  
 سب یکساں ہیں۔ یہاں پر دیگر تمام ضد اوذد ان حکمت کو سرعز  
 خم کر دینا پڑتا ہے اور اعلان کرنا پڑتا ہے کہ بیشک ہم راز  
 حیات کو نہیں سمجھے اور اسرار زندگی کا دریافت کرنا ہمارے  
 بس کی بات نہیں ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حیات ان کیٹروں  
 کا لازم ذات ہے کیونکہ موت کے بعد اُن ہی کیٹروں سے حیات  
 رخصت ہو جاتی ہے۔ بلکہ ماننا پڑے گا کہ حیات ان میں ایک خارجی  
 عرض ہے جو کسی مبداء فیاض سے اُن کو عطا ہوتا ہے اور پھر



سلب کر لیا جاتا ہے۔ یقیناً اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ حیات کسی قدرتی تخلیق و ایجاد کی منون احسان ہے اور ہر معلول کے لئے علت کے اصول پرذی حیات اشیاء کی زندگی ایک خدا ہے حی وقادر و حکیم کے وجود کی گواہ ہے۔

خدائی نظام قدرت کے انکار کرنے والے بہت کوششوں سے ایسی شاذ و نادر مثالوں کے دریافت کرنے کی رحمت اٹھاتے ہیں جہاں کچھ عجیب و غریب اتفاقات پیش آگئے ہیں یا غیر طبعی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ جیسے عورت کے شکم سے جانور کا بچہ پیدا ہو یا ایک چیز کی زراعت پر دوسری جنس کی چیز پیدا ہو جائے یا دوسرا کچھ اور چھ آنکلیوں کا آدمی اور اسی طرح کی صورتیں جہاں کوئی جزو زیادہ ہو گیا ہے یا کوئی جزو کم۔ ان تمام چیزوں کو پیش کیا جاتا ہے اس ثبوت میں کہ یہ دنیا کسی قادر و دانشمند کی کارکردگی کا نتیجہ نہیں ہے۔

مگر حقیقت یہ ایک تنکے کا سہارا ہے دو بنے دلے کے سامنے اس لئے کہ میں نے مادہ کے متحدہ! لطیفہ ہونے کی جو دلیل پیش کی تھی اُس کی بناء پر اس دنیا میں مختلف چیزوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی کا کوئی نظام قائم ہی نہیں ہونا چاہئے تاکہ اُس کی



بنا پر کوئی شے غیر طبیعی قرار پائے۔ مذکورہ صورتوں کا غیر طبیعی کہا جانا خود دلیل ہے اس کی کہ کوئی نظام قائم ہے۔

پھر ایک نظام کے جاری ہونے کے ساتھ اُس کے خلاف صورتوں کا بھی کبھی کبھی ہونا ہو جانا تو مادین کے خلاف خود ایک دلیل کا اضافہ کرتا ہے۔ وہ یوں کہ اگر مادہ کے تمام اجزاء تمام اشیاء میں طبیعت و حقیقت کے لحاظ سے بالکل متحد ہیں تب تو میں نے کہا کہ کائنات میں کوئی اختلاف ہونا ہی نہ چاہئے تھا اور یہ نظام ہی نہیں قائم ہونا چاہئے اور اگر ایسا ہے کہ ہر شے کے ذرات اپنی طبیعت و خاصیت کے لحاظ سے ذاتی طور پر اُسی شے کی تشکیل کر سکتے ہیں دوسرے ہی نہیں تو اس کے خلاف صورت کبھی پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے اُسے ناممکن ہونا چاہئے اور ناممکن بات شاید ونا در طریقہ سے بھی دافع میں ہو سکتی۔

اس لئے مذکورہ بالا مثالیں بھی خدا کے وجود کی ایک دلیل ہیں اور انھیں اُسی قادر و خلاق ہستی کے مظاہر قدرت کا ایک نمونہ سمجھنا چاہئے۔

—————



## خدا کے صفات

اُن ہی وجہ کی بنا پر جن سے میں نے مادہ کا خلقت کائنات کے لئے ناکافی ہونا ثابت کیا ہے آپ کو خدا کے صفات کا بھی ایک حد تک علم ہو جائیگا۔ مادہ اس لئے کائنات کے وجود کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ بے ثبات چیز ہے اور اُس میں حرکت کی وجہ سے نیستی کا پہلو شریک ہے۔ نیز یہ کہ وہ غیر ذکیات اور بے حس و شعور ہے۔ اس لئے دنیا کے حکیمانہ نظام کی تشکیل کا سبب نہیں قرار دیا جاسکتا۔

معلوم ہوا کہ خدا کیسا ہے وہ سراسر "نستی" ہے یعنی اُس میں کسی طرح "نستی" شریک نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہر حیثیت سے کامل ہے کیونکہ نقائص اور خرابیاں سب "نستی" کے پہلو سے پیدا ہوتی ہیں۔

وہ مرکب نہیں ہے یعنی اُس کے اجزاء نہیں پائے جاتے کیونکہ اس صورت میں وہ ان اجزاء کا محتاج ہوگا اور وہ اجزاء اُس سے مقدم ہونگے۔ لہذا وہ سب کا پیدا کرنے والا نہیں قرار پائے گا۔ سابق زمانہ کے مادیوں میں بھی چونکہ مادہ کو اصل اشیاء قرار دینا



چاہتے تھے اس لئے انہوں نے مادہ کو غیر قابل تقسیم اجزاء کا نام قرار دیا تھا۔ کیونکہ اگر اُس میں اجزاء پیدا ہوں تو پھر وہ اجزاء کا مخلج ہو گا اور یہ اجزاء اُس کے پیلے ہونگے۔ اور ان اجزاء سے قطع نظر رکھ کر اُس کا وجود کوئی چیز نہ رہے گا۔ اس لئے ازل سے لے کر اب تک کیلئے باتیں کو بھی ضرورت پڑی کہ وہ اجزاء فرض نہ کریں۔ اس لئے جو اہر مردہ کے وجود کو فرض کیا۔ حالانکہ صبیحہ میں نے بیان کیا سالما سے یہ جو ناقابل تجزیہ ہیں ان کو دیکھا نہیں جاسکتا۔ لیکن صرف اس لئے مان لیا گیا کہ اگر ایسا نہ ہو گا تو وہ قابل زوال ہونگے۔

اسی طرح "ایتھر" کو بسیط قرار دیا گیا کیونکہ اگر اُس میں اجزاء پائے گئے تو وہ قدیم نہ ہوں گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شے اجزاء رکھتی ہو وہ ازل سے لے کر اب تک نہیں ہو سکتی۔ آپ نے خدا کو مانا۔ اور خدا کو ازل سے لے کر اب تک تسلیم کیا تو اب اُس کو مرکب ماننے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا جسم نہیں ہے کیونکہ جب جسم ہو گا تو اُس میں اجزاء اور مقدار کا پایا جانا ضروری ہو گا۔ جسم اُس کو کہتے ہیں جس میں طول عرض عمق۔ یعنی لمبان۔ چوڑائی۔ مسان پائی جاتی ہو۔ جس میں یہ چیزیں پائی جاتی ہوں اُسی کو



جسم کہتے ہیں۔ تو اب خدا اگر جسم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس  
 میں لبان چوڑاں سُتان پانی جاتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ اُس کا  
 کی احتیاج پیدا ہوگی۔ وہ محتاج قرار پائیگا اور محدود ہو جائیگا۔  
 اس صورت میں وہ اول ہر اول کا نہ رہے گا۔ اس لئے کہ وہ  
 محتاج محل ہے تو پہلے محل مانئے پھر اُس کو مانئے۔ جب وہ محتاج  
 مکان ہے تو پہلے مکان مانئے پھر اُس کو مانئے۔ یہ تمام چیزیں اس کے  
 پہلے سے ہوگی۔ وہ اس کے بعد ہوگا۔ تو اب وہ قدیم کہاں رہا  
 اور موجود بالذات کہاں رہا۔ جب جسم نہیں ہے اور مکان و چیز  
 میں محدود نہیں ہے تو اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اُس کی روشنی  
 غیر ممکن ہے۔ یعنی آنکھوں سے دیکھنا اُس کا ممکن نہیں ہے  
 کیونکہ دیکھنا تو وہ چیز ہے جس سے جسم سے بھی متعلق نہیں ہو سکتا بلکہ اُس  
 جسم سے مخصوص ہے جو یوں و شکل رکھنا ہو اور قوت باصرہ کے  
 مقابل ہو۔ نہ نہ اگر رنگ اور شکل نہ ہو تو کوئی چیز ہم کو دکھلائی  
 نہ دے گی۔ رنگ و شکل کے ساتھ روشنی۔ یہ تین چیزیں وہ ہیں  
 جن کی بنا پر چیزیں ہم کو نظر آتی ہیں۔ اگر کوئی شے جسم ہی نہیں  
 رہتی ہے تو رنگ کہاں قائم ہوگا۔ کیونکہ رنگ تو ایک عرض ہے  
 جو غیر محل نہیں ہو سکتا۔ اور شکل کا ہے میں پیدا ہوگی جب خدا



جسم ہی نہیں ہے پھر میں تو کہتا ہوں کہ مستقل طور پر یہ محل بحث قرار دینا کہ رویتِ فلان ہے یا نہیں اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

غصہ کیوں نہیں دکھائی دیتا۔ اس لئے کہ جسم نہیں۔ درد دکھائیے

آگھڑی۔ آپ کہتے ہیں کہ کیا وہ جسم ہے جو دکھائی دے۔ آواز آنکھ سے

دکھائیے۔ نہ دکھلائی دگی۔ باوجودیکہ ہے۔ اس لئے کہ جسم نہیں ہے۔

گرمی و سردی آنکھ سے دکھائیے۔ نہیں دکھلائی دگی۔ اس لئے

کہ قوتِ لامسہ سے متعلق ہے جسم نہیں ہے جو آنکھ سے دکھائی دے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دکھلائی دینا وجود کا لازمہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب

چیزیں موجود ہیں مگر دکھلائی نہیں دیتیں۔ ہوا نہیں دکھلائی دیتی۔

باوجودیکہ جسم ہے۔ اس لئے کہ لطافتِ رنگ کے قائم ہونے سے مانع

ہے۔ دنیا میں خلا محال مانا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر مقام

پر کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ جو گھیرے ہوئے ہے فضا کو لیکن ہم کو نہیں دکھلائی

دیتی۔ اس لئے کہ وہ جسم ہے مگر لطیف جسم ہے جو نظر نہیں آتا۔

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ موجود ہونے کے لئے دکھائی

دینا ضروری نہیں ہے بلکہ دکھائی دینے کے لئے جسم۔ رنگ۔ شکل کا

مذا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ لطافتِ اتنی نہ ہو کہ جو نظر کے قائم

ہونے سے مانع ہو۔ اس کے بعد وہ شرائط ہوں جو ہر دیکھنے کے



قابل چیز کے لئے ضروری ہیں۔ یعنی وہ مقابل ہو۔ اتنا دور نہ ہو کہ نگاہ کام نہ کرے۔ اور اتنا قریب نہ ہو کہ نگاہ کو چھپالے۔ اگر کوئی شے جسم بھی ہے اور ان تمام شرائط کو نہیں رکھتی تو نہ دکھائی دے گی۔ پھر خدا جو جسم بھی نہیں ہے۔ کسی مکان میں بھی نہیں ہے۔ کسی جہت میں بھی نہیں ہے۔ محدود بھی نہیں ہے رنگ و شکل بھی نہیں رکھتا۔ وہ دکھائی کیونکر دے سکتا ہے۔ بالکل عقل کے خلاف ہے۔

اس صورت میں اگر کسی آیت یا روایت میں رویت کی لفظ کا اُس کی نسبت استعمال ہی کیا جائے تو اُس سے مجازی معنی مراد لئے جانا چاہئیں جو اُس کی ذات سے متعلق ہو سکتے ہوں۔ کیونکہ یہ چیز کا دیکھنا اُس کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے۔ اگر آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے تو آنکھ سے دیکھی جائیگی۔ لیکن اگر لوں شے آنکھ سے دیکھنے کی نہیں ہے۔ تو چونکہ دیکھنا انسان کے لئے ذریعہ یقین ہے۔ اس لئے اُس کے انتہائی یقین کو ثابت کرنے کے لئے دیکھنے کے لفظ کا استعمال صحیح ہوگا۔ لیکن اس کو ان معنوں میں استعمال کرنا کہ وہ آنکھوں سے دکھلائی دیتا ہے غلط ہوگا۔ کون سی چیز ہے جس کا یقین ہوا وہ انسان کو وہ مثل دیکھی ہوئی باتوں کے معلوم نہ ہوتی ہو بلکہ دیکھی ہوئی



ہاتھوں میں تو شبہ کا خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن بہت سی اُن دیکھی باتیں  
 اتنی یقینی ہوتی ہیں کہ اُن میں شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بگاہ تو  
 کبھی غلطی بھی کرتی ہے۔ وہ شخص جو چاند کے دیکھنے کے اشتیاق میں کھڑا  
 ہوا ہو۔ نہ معلوم کتنے چاند دیکھ لیتا ہے۔ اور خیال بھی کر لیتا  
 ہے کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیکھنے میں بھی انسان  
 کو دھوکا بھی ہوتا ہے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ جو مکہ معظمہ نہیں  
 گئے ہیں اُن کو خبریں پہنچتی ہیں کہ مکہ معظمہ کوئی چیز ہے۔ گر اُن سے  
 کہا جائے کہ آپ نے آنکھ سے تو دیکھا نہیں ہے کہ مکہ معظمہ کوئی چیز ہے  
 تو وہ اس معاملہ میں کسی شبہ کو قبول نہ کریں گے۔ چاند کے دیکھنے کو جابہ شبہ کی نظر سے دیکھیں  
 مگر وہ مکہ معظمہ کے لئے نہیں گئے کہ دیکھنے سے بڑھ کر وہ جابہ معلوم ہوتا ہو کہ یقین کا  
 درجہ وہی جو دیکھنے سے بڑھ کر انسان کے ذہن میں استحکام رکھتا ہے۔  
 ان معنوں سے کہا جاسکتا ہے کہ مومنین اپنے خدا کو دیکھتے ہیں  
 در صورتیکہ ہمارے قلوب ہمارے ادراکات۔ ہمارا ضمیر اُس کے وجود  
 کے احساس سے پر ہے۔ تو آنکھیں اُس کو نہیں دیکھتیں۔ مگر جسم  
 کا ہر ذرہ اُس کو دیکھتا ہے۔ اور اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اُسے  
 ہم نے دیکھا ہے۔ چنانچہ جب امیر المومنین سے پوچھا گیا اهل رأیت  
 منہاک "آپ نے اپنے خدا کو دیکھا ہے؟"۔



آپ نے فرمایا وکیف اعبدہ بالمرأۃ " پھر میں عبادت کیسی کرتا ہوں اُس خدا کی جس کو دیکھا نہیں " اس کے بعد ہی آپ نے فرمایا۔  
 لَا تَوَاهِ الْعُیُونُ بِمَوَاطِنِ الْأَبْصَارِ وَلَكِنْ رَأَى الْقُلُوبُ بِحَقَائِقِ الْإِيمَانِ " آنکھیں اُس کو اپنی نگاہ سے نہیں دیکھتیں لیکن دل اس کو اپنے ایمان کے ساتھ دیکھتے ہیں۔"

اُس کا کمال معرفت۔ اُس کے وجود کا کمال علم و یقین بس یہ ہے اُس کے لحاظ سے دیکھنا۔ مادی دیکھنا غیر مادی چیزیں تلاش کیا جائے تو غلطی ہے۔ مادی چیز کا دیکھنا بھی مادی ہے۔ اور غیر مادی چیز کا دیکھنا بھی غیر مادی ہے۔ جیسے لفظ آب صرف کر دیجئے۔ مگر حقیقت بدلے۔ کیونکہ لفظیں تو ہماری بنائی ہوئی ہیں۔ معنی ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔ امام سے دریافت کیا گیا۔ کیا بندہ خدا نور و زقیامت دیکھیں گے؟ آپ نے فرمایا اور وجود کے پہلے بھی تو اُس کو دیکھا تھا عالم الست میں۔ اُس نے کہا اچھا! اُس وقت بھی دیکھا تھا؟ ایک تھوڑی سی خاموشی کے بعد آپ نے فرمایا " کیا مومن اس دنیا میں ہیں دیکھتا اُس کو؟ وہ حیران ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ تحیر کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا اُس دنیا میں بھی تو مومنین دیکھتے ہیں۔ آخر میں آپ نے فرمایا کہ یہ آنکھیں اُس کا



شاید نہیں کرتیں۔ دال اُس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔  
 اگر "یہ بت" کے معنی انتہائی معرفت کے لئے جائیں تو نزاع  
 کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اس حیثیت سے بیشک جتنے پردے  
 ہادی ہتے جائیں گے اتنی ہی اُس کی معرفت انسان کو کامل ہوتی  
 جائیگی اور جس وقت کہ یہ عالم کا دور ختم ہوگا فکشفنا عنک غطاء  
 فصور لبوم حلید" اب پر دے تیری آنکھوں سے اٹھ گئے۔ اب  
 تیری آنکھیں بہت تیز ہو گئیں۔ یعنی وہ حجاب غفلت کے جو آنکھوں  
 پر پڑے ہوئے تھے دور ہو گئے۔ اور وہ حقیقتیں جو محل شک میں تھیں  
 محققین میں آگئیں۔ ان معنوں سے چاہے آپ کہئے کہ روز قیامت  
 بندے خدا کو دیکھیں گے۔ لیکن یہ مومنین سے مخصوص نہیں ہے۔  
 پردے تو اصل میں کافروں کی آنکھ سے اٹھیں گے۔ رہ گئے  
 مومنین موقنین۔ ان کی آنکھوں پر سے اس دنیا میں بھی پردے  
 اٹھے ہوئے ہیں۔

میں نے یہ عجیب ترتیب قرار دی اپنے بیان میں کہ صفات  
 سلبیہ کو مقدم کر دیا صفات ثبوتیہ پر۔ کتابوں میں اس کا عکس  
 ہوتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سلب ان چیزوں کا انسان کو  
 متوجہ کرتا ہے اُس کے کمال کی جانب۔ انسان جب ان نقائص کو



دور کرتا ہے خدا کی ذات سے تب وہ قریب ہوتا ہے اُس کی فطرت  
 اسی وجہ سے آپ قرآن مجید میں ملاحظہ فرمائیے تسبیح پر زیادہ زور  
 دیا گیا ہے بنسبت ”حمد“ کے تسبیح کے معنی ہیں نقائص سے اُس  
 بری کرنا ”حمد“ کے معنی ہیں کمالات کا ثابت کرنا۔ قرآن مجید میں  
 ملاحظہ فرمائیے کہ وہ کم مقامات ہیں جہاں اُس کے ”حمد“ پر زور  
 دیا گیا ہے۔ لیکن ”تسبیح“ کے لئے مختلف طریقے بستجہ اللہ۔  
 سبح اسم۔ سبحان الذی۔ سبحہ اللہ۔ اسی طرح سے مختلف  
 مقامات پر تسبیح سے سورتوں کی ابتدا کی ہے تاکہ اُس کی ذات  
 سے نقائص کو دور کرے۔ اور اگر کسی نے اُس کو نقص سے  
 نسبت دی تو زبان پر تو ہوگا لفظ خدا کا مگر حقیقتہً اعتقاد اُس  
 سے متعلق نہیں ہوگا۔ اگر انسان نے اُس کی تعریف کو کچھ نقائص  
 کے ساتھ مخلوط کر دیا تو اب وہ ہستی جو تمہارے دل و دماغ میں  
 آئیگی وہ حقیقتہً خدا نہ ہوگا۔ جس کی اس عالم تکوین میں ضرورت  
 ہے لیکن ہم اگر کہیں کہ وہ جو ان نقائص سے بری ہے لیکن اس  
 کے آگے ہم کچھ نہ بتا سکیں تو ہم نے چاہے اُس کا وصف نہ بیان  
 کیا ہو لیکن پھر بھی کسی نہ کسی حد تک اُس کی ہستی کا پتہ دے دیا  
 اس سے معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ اہم ہے انسان کے لئے ا ن



باتوں کا سمجھنا جو خدا میں نہیں ہونا چاہئیں۔ ان باتوں کا  
 شراعی ذریعہ ہوگا اُس کے کماں تک انسانی حدود میں پہنچنے کا  
 مثلاً اگر جسم و جسمانیات کو تمہنے خدا کی ذات سے دور کر دیا تو نقص  
 جتنے تھے وہ اُس کی ذات سے الگ ہو گئے۔ اس لئے کہ ایک  
 چیز ہے وجود یعنی ہستی۔ اور ایک چیز ہے اُس کا محدود ہونا۔ یہ  
 خرابیاں جتنی پیدا ہوتی ہیں سب محدود ہونے سے پیدا ہوتی ہیں  
 اور تمنا دو جو کہ جہاں تک دیکھئے کمال ہی کمال ہے جس میں  
 نقص کی گنجائش نہیں ہے۔ جب وہ سرا ستر ہستی ہے تو پھر اُس  
 کے لئے امتیاج و تہیدستی کمیں سے پیدا نہیں ہو سکتی اس کو  
 ایک اور نتیجہ بہت آسانی سے نکلتا ہے اور وہ یہ کہ اُس کے  
 کمال کے فرض کرنے کے لئے الگ سے صفتیں ملانے کی ضرورت  
 نہیں ہے۔ کیونکہ علحدہ سے صفتیں جب ملانی جاتی ہیں کہ خود  
 وجود بجائے خود مکمل نہ ہو۔ مثلاً میں اپنے میں بحیثیت انسان کے  
 دیکھوں۔ تو انسان جاہل بھی ہو سکتا ہے عالم بھی ہو سکتا ہے یعنی  
 بحیثیت ذات اس کی ضرورت نہیں ہے کہ چیزیں معلوم ہی ہوں۔  
 لہذا ضرورت ہے کہ انسان کے آگے میں کسی اور چیز کا تصور کروں  
 جس کا نام ہے۔ علم۔ تو انسان ایک چیز ہے اور اُس کا علم



دوسری چیز ہے اگر علم کا الگ سے تصور نہیں کرتے تو تنہا اُس کی ذات  
 ذمہ دار نہیں ہے۔ اشیاء کو معلوم کرنے کی۔ اسی طرح انسان کو  
 ہم دیکھیں تو چونکہ وہ عاجز بھی ہو سکتا ہے۔ قادر بھی ہو سکتا ہے  
 معلوم ہوا کہ تنہا انسان کی ذات قدرت رکھنے کی ذمہ دار نہیں  
 ہو سکتی۔ لہذا اس کی ذات کے آگے بھی کسی چیز کی ضرورت  
 ہے۔ اس کو میں کہوں گا کہ صفت ہے۔ جس کا نام ہے قدرت  
 انسان کی ذات کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زندہ بھی ہو سکتا ہے۔  
 مردہ بھی ہو سکتا ہے۔ لہذا ہم انسان کو ایک الگ چیز ماننا چاہیے  
 اور حیات ایک الگ چیز ماننا پڑے گی۔ اگر خدا کو بھی ہم یوں ہی  
 مانیں کہ تنہا ذات ہے جس میں عاجز ہونے کی بھی گنجائش ہے  
 اُس کی ذات کو دیکھتے ہوئے اُس میں عدم کی بھی گنجائش ہے  
 اُس کی ذات کو دیکھتے ہوئے اُس میں طویل ہونے کی بھی گنجائش ہے اُس کی ذات کو دیکھتے ہوئے  
 تو بیشک اُس کی ذات کو الگ اُس کی ذات کے ماوراء اُس کی ذات کے علاوہ صفتیں قرار دینا  
 چاہیے۔ خدا ایک تو ذات ہوا پھر کچھ اُس کی صفتیں ہوئیں جو ذات کے علاوہ ہیں۔  
 علاوہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ذات بحیثیت ذات اُن کمالات  
 کی حامل نہیں ہے جو ان صفتوں سے متعلق ہیں۔ اور پھر یہ بھی  
 ماننا پڑے گا کہ چونکہ ذات ہمیشہ سے ہے۔ اگر یہ کمالات اُس کے



بعد ہوں تو ضرورت ہوتی ہے کہ ان صفتوں کے پہلے وہ جاہل ہو  
 لہذا جس طرح ذات خدا کی قدیم ہے اسی طرح ان صفتوں کو بھی  
 قدیم ہونا چاہئے۔ تو اب ایک تو قدیم خدا کی ذات ہے اور آٹھ قدیم  
 اس کی صفتیں ہوں گی۔ عالم۔ قادر۔ مدبر۔ حی۔ سمیع۔ بصیر۔  
 مرید و کا۔ ہ۔ متکلم۔ تو ایک تو خدا ہوا۔ اور یہ آٹھ صفتیں ہوں گی۔  
 لیکن یہ آٹھوں صفتیں جو قدیم ہوں گی ان سے نظر کو ہٹا کر  
 دیکھئے خدا کی ذات کو تو صفر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی  
 ذات بحیثیت خود کمالات سے عاری ہے۔ تو پھر یہ سوال پیدا  
 ہوگا کہ ذات و صفات میں تلامذہ کیوں قائم ہے جب کہ وہ ایک  
 الگ چیز ہے اور یہ الگ چیزیں ہیں۔ اور بحیثیت ذات ذات میں  
 ان کمالات کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سوال پیدا ہونا چاہئے کہ  
 ذات میں یہ صفات کیوں قرار پائے۔ اور تلامذہ کیوں پیدا یعنی  
 خدا کی ذات جب سے ہے تب سے وہ عالم کیوں ہو؟ قادر کیوں  
 ہو؟ قدیم کیوں ہو؟ اگر آپ نے کہا کہ خود ذات الہی جاہلی ہے  
 اس بات کو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خود ذات بحیثیت ذات  
 کمالات کی حامل ہے۔ پھر ذات کے علاوہ کوئی اور چیز ماننے  
 کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور اگر بحیثیت ذات تفاضلاً نہیں ہوتا



اس بات کا کہ اشیا کا انکشاف بھی ہو۔ چیزیں معلوم ہوں۔ تو کیا وجہ کہ اس کی ذات کے ساتھ علم بھی ہو۔ اور ذات کے ساتھ قدرت بھی ہو۔ پھر یہ عالم وقادہ اور حی وغیرہ وغیرہ تمام صفتیں جب ذات سے جدا گانہ ہیں تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ کیا یہ صفات خدا کے مخلوق ہیں یا نہیں۔ اگر کہیں کہ خدا کے مخلوق ہیں۔ یعنی خدا نے اپنے علم کو پیدا کیا۔ خدا نے اپنی حیات کو پیدا کیا تو جب تک کہ خدا اپنے علم کو پیدا کرے وہ جاہل ہے۔ جب تک کہ خدا اپنی حیات کو پیدا کرے وہ مردہ ہے۔ جب تک کہ خدا اپنی قدرت کو پیدا کرے وہ بے اقتدار ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا کے مخلوق نہیں ہیں یہ صفات۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مستقل قدیم واجب الوجود ہیں اور خدا سے بے نیاز ہیں۔ تو ذات و صفات میں تفریق کیوں قرار پائی کہ ایک ذات اور آئمہ عفتیں۔ یہ غور کرنے کے قابل چیز ہے۔

عام طور سے ذات و صفات کی تعریف قرار پاتی ہے کہ جو چیز محتاج اور محتاج الیہ ہو وہ ذات ہے اور جو چیز اس کی طرف محتاج ہو اور محتاج ہو وہ صفت ہے۔ لیکن جبکہ صفات مستقل قدیم ہیں اور جس طرح ذات مستقل ہے اسی طرح وہ آئمہ بھی بے نیاز ہیں تو



کون سی ترجیح پیدا ہوتی ہے کہ اُن میں سے ایک کو ذات قرار دیا جائے اور آٹھ کو صفات۔ اور جبکہ ایک دوسرے کا محتاج نہیں ہے تو اُن میں اہمیت کس لئے ہے۔ ترکیب و اجتماع باہمی احتیاج سے پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ ایک دوسرے میں اگر ارتباط و احتیاج نہ ہو تو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ایک چیز دوسری چیز کے ساتھ مل کر پائی جائے۔ جب خدا کی ذات یعنی خدا۔ مجموعہ ہے تو چیزوں کا جس میں ایک ذات ہے اور آٹھ صفات۔ اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ تو ضرورت کیا پیدا ہوئی کہ یہ سب مل کر رہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ آٹھوں بجائے خود قدیم ہیں۔ لیکن جب علم و قدرت کو دیکھتے ہیں اور پھر بغیر حیات کے اُس کا خاکہ کرتے ہیں تو کوئی مفہوم ہی نہیں قرار پاتا۔ کیونکہ علم و قدرت بغیر حیات کی چیز ہی نہیں ہے۔ پھر ان سب کو کم مستقل ایک دوسرے کے مقابل اور قدیم کیسے سمجھ لیں۔ اور نتیجہ اگر یہ سب ایک دوسرے کے مقابل قدیم ہیں تو خالق کائنات ان سب کا مجموعہ ہی یا ان میں سے ایک یا کوئی بھی نہیں۔ یہ تو قدیم ایک دوسرے کے مقابل ازل سے ہیں تو خالق کائنات کون چیز ہے۔ اگر



خالق کائنات ذات خدا ہے تو علم و قدرت کو کوئی دخل اُس میں نہیں ہے۔ اگر خالق علم و قدرت ہے تو ذات کو ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یعنی تنہا علم و قدرت ہی کافی ہے۔ یہ اتنے قدیم جو ہیں جب ایک کو دوسرے کی ضرورت ہی نہیں ہے تو ان سب کی حاجت کیا ہے۔ ان میں سے ایک ہی کافی ہے۔ غرض یہ ہر کہ یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ درحقیقت خدا کی وحدت نہیں قائم رہ سکتی۔

اسی وجہ سے امیر المومنین علیہ السلام نے نبی البلاغہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ :-

من کمال الاخلاص له في الصفات، عنه شهادة كل موصوف الله غير الصفة وشهادة كل صفة انما غير الموصوف فمن وصف الله سبحانه فقد ثناه ومن ثناه فقد جزاه ومن جزاه فقد جهده ومن جهده فقد اشار اليه ومن اشار اليه فقد حده ومن حده فقد عدّه.

”خدا کی خالص توحید کا ثملہ یہ ہے کہ صفات کی اُس سے نفی کی جائے یعنی اُس کو ذات ہی ذات ماننے اس کے علاوہ صفت کا قائل نہ ہو۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں۔



”کیونکہ ادھر تم نے صفت مانی تو پھر صفت مفہوم ہی کا تقاضا  
یہ ہے کہ وہ موصوف سے جدا ہو اور خود موصوف کے معنی کا لانا  
یہ ہے کہ وہ صفت سے کوئی الگ چیز ہے۔

”تو جس نے اُس کے لئے صفتیں قرار دیں اُس نے اُسے ایک سے  
زیادہ مان لیا۔ اور جس نے ایک سے زیادہ مان لیا اُس نے اُسے  
مکرب مان لیا اور جس نے اُس کا تجزیہ کر لیا اُس نے حقیقت خدا  
کو خدا ہی نہیں سمجھا۔ اور اُس کو نہ سمجھنے کی بنا پر اُس نے قابل  
اشارہ حسیہ سمجھ لیا اور محدود بنادیا اور اس طرح عام چیزوں کے  
شمار میں لے آیا۔“

## صفات ثبوتیہ

خدا سراسر ہستی ہے۔ اسی میں تمام صفات ثبوتیہ مضمر ہیں۔  
کیونکہ ہستی ہر کمال کا مرکز ہے۔ اس کو الفاظ میں تشریح کیجئے تو  
مقام تعبیر میں مختلف چیزیں قرار پاتی ہیں۔ لیکن حقیقتہً وہ کچھ الگ  
الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اُس میں جب نیستی کا گزر نہیں تو اسی  
سے ظاہر ہے کہ وہ قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا  
اسی کو ازلی اور ابدی کہتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ بھی اسی



دنیا کا ایک جزو ہوگا اور اس کے واسطے بھی کسی پیدا کرنے والے کی ضرورت ہوگی۔ تو پھر وہ خالق کل نہ ہوگا۔

اُس نے دنیا کو ارادہ و اختیار کے ساتھ پیدا کیا ہے اس لئے کہ اُس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر ہیں اور ایک خاص انتظام نظر آتا ہے۔

اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا عالم و قادر ہے کیونکہ بغیر علم کے حکمت و مصلحت بنی پیدا نہیں ہو سکتی اور بغیر قدرت کے ارادہ و اختیار کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اسی علم و قدرت کے لحاظ سے وہی یعنی زندہ ہے کیونکہ شعور و عمل بھی دو چیزیں زندگی کے خاص آثار ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی معنی حیات کے خداوند عالم کے لئے ثابت نہیں کئے جاسکتے۔

مگر یہ علم و قدرت اور حیات جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا خدا کی ذات سے جدا گانہ کوئی چیز نہیں ہیں۔

خدا کو ہم عالم کہتے ہیں۔ خدا کو قادر کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات صفت علم سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ بدرجہ کمال اُس کی ذات کو خود حاصل ہے جو کچھ صفت قدرت سے پیدا ہوتا ہے وہ درجہ کمال خود اُس کی ذات کے لئے ہے۔ جو کچھ



حیات سے پیدا ہوتا ہے وہ بذات خود اُس کی ذات کے لئے حاصل ہے۔ مثلاً چیزوں کا منکشف ہونا۔ واقعیت کا حاصل ہونا یہ نتیجہ ہے علم کا۔ ہم میں یعنی ہماری ذات میں یہ بات صفتِ علم کے ضمیمہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کے یہاں اس ضمیمہ کی ضرورت نہیں خود اُس کی ذات کے لئے وہ بات حاصل ہے، اس کے ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔ سوائے لفظِ علم کے اس لئے ہم خدا کو کہتے ہیں عالم۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُس کی ذات اور ہے علم اور ہے۔ بلکہ علم کا جو نتیجہ ہے وہ اُس کی ذات ہی میں حاصل ہے۔ کائنات پر قابو ہونا یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟ قدرت کا۔ یہ خدا کو بذات خود حاصل ہے۔ اس لئے اُس کو کہتے ہیں قادر۔ چونکہ نتیجہ قدرت کا اس کے لئے حاصل ہے مگر یہ نہیں ہے کہ اُس کی ذات کے علاوہ کچھ ہو جس کو کہیں قدرت۔

عام علم کلام کی کتابوں میں جو خدا کے صفات درج کئے ہیں عام قادر۔ جی یعنی زندہ۔ مرید۔ کارہ۔ سمیع و بصیر۔ مدبر۔ حکم۔ آپ اگر ان صفات کو دیکھیے تو سب جا کر جمع ہو جاتے ہیں علم و قدرت میں۔ علم کے معنی کیا ہیں؟ تمام چیزوں پر کمالِ اطلاع حاصل ہونا



قدرت کے معنی کیا؟ تمام چیزوں کا قابو میں ہونا۔ پھر یہ نفع میں جو ہم ادا کرتے ہیں۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟ حقیقتہً قدرت و علم دونوں ایک طرح کے احاطے ہوتے ہیں۔ کسی شے کا تسلط اور تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہونا۔ اسی کے ایک پہلو کا نام ہی علم اور ایک پہلو کا نام ہے قدرت۔

انسان کے لئے باطنی تورت یعنی ادراکات ہیں۔ ان ادراکات کے اعتبار سے جو کسی شے کو گھیرتا ہے اور احاطہ کرتا ہے یعنی وہ چیز سماتی ہے اُس کے ادراکات ہیں۔ تو اس طرح کے احاطہ کو کہتے ہیں علم اور وہ چیز جو انسان کے عمل کے حدود میں ہوتی ہے۔ اُس کو کہتے ہیں قدرت۔ یعنی انسان میں دو جوہر ہیں الگ الگ۔ ایک ادراک اور ایک عمل۔ ادراک کے احاطہ میں ہونا علم ہے۔ اور عمل کے احاطہ میں ہونا۔ اس کا نام ہے قدرت۔

اب دیکھئے خدا کی ذات کو جو عالم و قادر کہتے ہیں وہ کس بنا پر ہے۔ بات یہ ہے کہ جتنی کائناتیں ہیں، اس کی نسبت جو خدا کے احاطہ سے دیکھتے ہیں تو وہ خالق ہے۔ یہ مخلوق۔ وہ پیدا کرنے والا ہے یہ پیدا ہونے والی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اس تمام کائنات سے مافوق ہے۔ یعنی اُس کی ہستی ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔



محکمیت مخلوق ہونے کے یہ تمام ہستیاں اُس کی ہستی میں کھری ہوئی ہیں۔  
 کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ خالق نہ ہو۔ اور یہ چیزیں مخلوق نہ ہوں۔  
 اُس کا سراسرستی "ہونے کی بنا پر مرکز وجود ہونا اور اُس کے پاس ہونا"  
 ہر موجود کا اُس کی طرف محتاج ہونا، اسی کا نتیجہ ہے کہ اُس کو ہر  
 پر کامل احاطہ حاصل ہے، اسی کامل احاطہ کا نام ہے علم اور دوزخی  
 حیثیت۔ اسی کا نام ہے قدرت۔ اسی پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس کی  
 قدرت دُعا کسی خاص چیز سے مخصوص نہیں ہے۔ کیونکہ تمام کائنات  
 ہے ممکن، اور وہ ہے واجب۔ تمام کائنات ہے حادث اور  
 وہ ہے قدیم۔ اس سے سب چیزوں کو یکساں نسبت اُس کے  
 ساتھ حاصل ہے۔ جب یکساں نسبت ہے تو اُس میں تفریق  
 نہیں قائم ہو سکتی۔ کہ بعض چیزوں کو جانتا ہے اور بعض کو نہیں  
 جانتا۔ اور بعض پر قدرت رکھتا ہے بعض پر نہیں رکھتا ہے۔

اگر آپ عالم کائنات پر غور کیجئے تو اس دنیا کی ہر چیز  
 اور ہر ذرہ چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اُسی نظام میں منسلک  
 ہے جو نظام خلقت کا قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس نظام سے کوئی  
 چیز خارج ہوتی تو میں کہتا کہ خدا کو اس چیز کو جاننے کی ضرورت  
 نہیں ہے لیکن جبکہ تمام چیزیں ایک نظام میں منسلک ہیں۔ تو



اگر جانتا ہے تو سب کو اور نہیں جانتا تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔ اب چونکہ اُس کا علم و قدرت ثابت ہو چکا تو اُس کی عمومیت بھی اُسی کے ساتھ ثابت ہے۔ وہ عالم کل اور قادر مطلق ہے۔ کوئی شے اُس کے احاطہ علم و قدرت سے خارج نہیں ہے۔

یہ ہے صحیح عقیدہ الوہیت خدا کے متعلق جو مسلمانوں کے حق پرست فرقہ میں پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ہستی اگر کوئی چیز ہے تو پھر وہ انہی صفات کی ہو سکتی ہے۔ یا تو مادّی کے نقطہ نظر کے موافق وہ ہو ہی نہیں اور اُس کا وجود تسلیم ہی نہ کیا جائے مگر یہ ثابت کیا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ خدا کا وجود یقینی ہے تو پھر جب وہ ہی تو جسم مرگز نہیں ہے۔ جسمانیات سے بڑا اور منزه ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ بس انسان یا ادھر چلا جائے یا ادھر چلا آئے۔ یعنی عقلی حیثیت سے یا تو وہ ہے ہی نہیں یا اگر ہے تو پھر ایسا ہی ہے جیسا مسلمانوں کا صحیح عقیدہ ہے۔ درمیان میں کوئی منزل نہیں نہیں ہونا چاہئے۔

خدا کی ہستی کو مان لینے کے بعد یہ کہ وہ علوں بھی کر سکتا ہے وہ چلتا پھرتا بھی ہے۔ ٹہلتا بھی ہے۔ وہ ایک جگہ ٹھکن بھی ہو اور محدود بھی۔ مرگز خدا شناسی کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ ایسے خدا



کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہم بھی ایسے خدا بنا سکتے ہیں اور اگر خدا کے نام سے محبت ہے تو ہر شخص اپنا نام خدا رکھ سکتا ہے لیکن ہمیں تو اُس حقیقت کی تلاش ہے جو ان مادی حدود سے بلند ہو۔ ورنہ مادی بنیادوں کے جو اہر فردہ اور سالمات کیا برے تھے ماننے کے لئے۔ لیکن انھیں اس لئے مانا نہیں گیا کہ اُن میں نقائص پائے جاتے ہیں۔ تو اب اگر ہم نے خدا کو بھی ایسا مانا جو ان ہی نقائص سے گھرا ہوا ہو تو ہمیں حاصل ہی کیا ہو اگر خدا کو آپ مانتے ہیں تو اُس کو بلند مٹی سے عام مادی چیزوں سے آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی بادشاہ ہے۔ وہ تخت پر بیٹھا ہے تو اب خدا چونکہ مالک الملک ہے تو وہ بھی تخت پر ضرور بیٹھے۔ پھر بتیریہ ہے کہ ان ہی بادشاہوں میں سب سے بڑا بادشاہ ہو اُسی کو خدا مان لیجئے اور آپ کے مد تصور میں جو بڑے سے بڑا تخت ہو وہ اُس کے لئے بنوا دیجئے۔

عقل ہرگز اس کو قبول نہیں کر سکتی جس طرح عیسائیوں کا عقیدہ کہ خدا نے بحیثیت باپ کے عیسیٰ کو پیدا کیا اور عیسیٰ کے ساتھ متحد ہو گیا اس طرح کہ روح القدس عیسیٰ اور خدا سب ایک۔ پھر لطیف یہ ہے کہ وہ خدا اپنے اُس مجسمہ کے



ساتھ جو عیسیٰ کے شکل میں تھا سولی پر بھی چڑھ جاتا ہوا اس طرح کم سے کم ایک تہائی خدا نکھٹ گیا۔ جب سولی دیدی گئی۔ اس لئے کہ تین سے مرکب تھا۔ روح القدس تھا۔ بیٹا تھا۔ باپ تھا جس وقت بیٹا اپنی امت پر فدا ہو گیا تو کم سے کم انوہیت کی تپائی کا ایک پایہ ٹوٹ گیا۔ اب دو پیروں پر اگر خدائی کھڑی رہے تو کھڑی رہے۔

اسی طرح مجوسوں کا عقیدہ کہ خدا ہے اور ایک اور ہستی خدا کے بمقابلہ ہے وہ اُس کے ساتھ ہے۔ خدا اچھا بیوں کو پیدا کرتا ہے۔ اور وہ ہستی برا بیوں کو پیدا کرتی ہے۔ توجہ برا بیوں کی پیدا کرنے والی وہ ہستی ہے تو پھر بھی قابلِ تعظیم ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی خدا ہے۔ یعنی یزدان و اہرمن کا عقیدہ جسے ایران کے قدیم لوگ مانتے تھے۔

یہ انسان کی کوتاہ نظری ہے۔ مادہ کے ساتھ انسان کو محبت ہے۔ اگر وہ عقلی دلائل سے مجبور ہو کر خدا کو مانتا بھی ہو تو اُسے حارہ پہنا دیتا ہے مادہ کا۔ اسی کا نتیجہ ہے خدا کے ماننے کے بعد اُس کے لئے جسمانی مظاہر کی تلاش کرتا ہے کہ وہ جسم کے اندر ہو کر نمایاں ہو۔ اب جس وقت کہ ایک جسم کے اندر وہ محدود ہی



تو تمام عالم کائنات خدا سے خالی ہو جائیگا۔ پھر جب عالم کائنات  
 خدا سے خالی رہ سکتا ہے تو خدا کی ضرورت ہی نہ رہی۔ درحقیقت  
 یہ ایسی چیزیں ہیں جو عقلی معیار بحث ہی پر نہیں آتیں۔ کہ کوئی سنجیدہ گفتگو  
 کی جائے۔ عقلی اور اصولی بحث تو بس خدا کے وجود و عدم پر ہو سکتی  
 ہے۔ وہاں تک تو عقل کو سوچنے کا محل پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد  
 کوئی سنجیدہ بحث کا محل باقی ہی نہیں رہتا۔ جیسے توحید کا مسئلہ۔ جن بناؤں  
 پر خدا کے وجود کو ہم نے سمجھا وہ ضرورت ایک کو ماننے سے پوری ہو گئی  
 تو یہ دیکھ کر صبر سے آگئے۔ یعنی ان دلائل کا تقاضا جو خدا کے وجود کو  
 ماننے کے متعلق ہیں یہ ہے کہ خدا کے غیر نظام عالم برقرار نہیں رہ سکتا  
 تھا۔ جب ایک کے ہونے سے کام چلنے لگا تو وہ دوسرا کیا ہوگا؟ خالی  
 بیٹھا رہیگا؟ اس کے لئے کوئی کام نہیں ہے۔ تو وہ معطل ہوگا۔ اور  
 معطل چیز کبھی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اب اگر کچھ کریگا تو وہ کیا ہوگا۔  
 جب یہ کام کر رہا ہے تو اس کا کام صرف تخریب ہی رہ جائے گا  
 روئے اٹکانا اس کا کام ہوگا۔ اسی لئے قرآن مجید میں کہا گیا ہے  
 لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا - اگر زمین و آسمان میں  
 ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو فساد برپا ہوتا۔  
 اس لئے کہ ایک مصروف انتظام ہے۔ دوسرا جو کام کرے گا تو وہ



بس اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے تو خدا نہ رہا۔ کیونکہ یہ تو خدائی ہے۔ یہ کوئی آپ کے جلسے نہیں تو میں نہیں کہ اس میں محرکوں اور مؤیدوں کی ضرورت ہو۔ اب اگر وہ بھی ارادہ کرتا ہے اور وہ اس کے موافق ہے تو اُس کا کوئی فائدہ نہیں اور اگر اُس کے خلاف ہے اس کا ارادہ تو دونوں ناکام ہونگے۔ یا ایک کامیاب ہوگا دوسرا ناکام ہوگا۔ اگر دونوں ناکام رہے تو دونوں خدا نہ رہے۔ اور اگر ایک ناکام رہا۔ تو وہ خدائی سے معزول۔

معلوم ہوا کہ خدا کو ماننے کے بعد ایک سے زائد ماننا کوئی عقل بنیاد اس کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح خدا کو ماننے کے بعد اُس کو حیز و مکان کا محتاج ماننا۔ یہ وہ خدا ہی نہیں جسے عقل نے کہا تھا کہ ضرور ہے۔ خدا کے ماننے کے بعد اُس کو یہ کہنا کہ وہ دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ تو حقیقت خدا کا جسم بھی مان لینا ہے اور محدود بھی مان لینا ہے۔ اس کے بعد کوئی معنی نہیں ہوتا اُس کے کہ جسم نہیں ہے۔ اور اگر جسم نہیں ہے تو اُس کو دیکھنے کے کوئی معنی نہیں رہتا۔

پھر میں ہی کہوں گا کہ آپ کے نزدیک اگر خدا ہے تو اگر ٹھہریے جیسی فقط تک جسے ہم مانتے ہیں مگر اگر نہیں ہے تو لئے کہ کچھ نہیں ہے جس کے بعد درمیان میں آکر ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔



اسی بنا پر قرآن مجید میں آیا ہے :-

وَمِنْ يَتَّبِعْ خَيْرَ الْأَسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُضِلَّ مِنْهُ

”اسلام کے علاوہ اگر کوئی دین اختیار کرے گا تو وہ قابل قبول نہ ہوگا“

یعنی عَمَلًا یا تو ”لادینی“ ہے اور یا دین ہے تو اسلام اور حقیقت وہ

مذہب فطرت جس میں خدا شناسی کی صحیح تعلیم دی گئی ہو وہ اسلام ہی

کا مذہب حق ہے جس پر سچے رہنمایان اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ”مادیت“ ہے جس کو خدا پرستی کا

لباس پہنایا گیا ہے۔ صرف الفاظ ہیں جن میں خدا کا اقرار ہے لیکن

حقیقت اُس سے انکار ہے۔

دنیا کو چاہئے کہ وہ عقل سے کام لے اور خدا شناسی کی منزل میں

اسلام کے رہنمایان حقیقی کے تعلیمات کو اپنا دلیل راہ بنائے تو منزل

حقیقت سے دوچار ہوگی اور خدا کی سچی معرفت کے درجہ تک پہنچ سکے گی

## خدا پرستی اور مادیت کی جنگ

آج کل اکثر حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ مادیت دنیا

میں ترقی کر رہی ہے اور ایمان باللہ کا عقیدہ بہت کم ہوتا جا رہا

ہے۔ اس سے ایک طرف تو پرستاران مادہ کلاہ فخر آسمان پر



اُچھالتے ہیں 'اور یہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ ایک وقت میں دنیا سونڈ  
بالکل مٹ جائیگا۔ دوسری طرف اہل مذہب پر مایوسی چھاتی ہے اور  
وہ سمجھتے ہیں کہ اب ہم انتہائی کمزور ہو گئے ہیں۔

مگر کیا یہ خیال صحیح ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ دنیا  
میں خدا پرستی اور مادیت کی جنگ ہمیشہ سے جاری ہے۔ اور انسان  
چونکہ خود مادی خواہشوں میں اور مادیات کے شکنجہ میں اسیر ہے  
اس لئے اکثر افراد ہمیشہ سے خدا کے منکر رہے ہیں۔ اور وہ افراد  
بہت کم رہے جو خدا کو واقعی مانتے ہوں لیکن یہ لوگ اپنے غم  
وارادہ اور قوتِ امان و اعتقاد سے ہمیشہ اس جنگ میں کامیاب  
ہوتے رہے اور مادیت کو شکست موتی رہی۔

ہمارا مذہبیت کے بڑھنے کا انتہائی مشکوک زمانہ  
ہے جیسے ہر زمانہ کا شخص اپنے زمانہ کی برفاری کا اور ہر عالم اپنی  
زمانہ میں ناقدری عالم کا مرتبہ پر ہتیار ہا ہے۔ اگر آپ ہر دو کے مصنفین  
کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے تو اس میں اپنے زمانہ کا اس طرح درودنا  
الفاظ میں تذکرہ ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُس حالت سے بدتر  
حالت ابھی نہیں سکتی۔ ہم اُن الفاظ کے لحاظ سے اگر رفتار نثر  
کی بناء پر اپنے زمانہ کا قیاس کریں تو چاہئے کہ ہمارے وقت میں



ایک نقطہ بھی اچھائی کا باقی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نتیجہ ہے اس بات کا کہ انسان کو اپنے سامنے کے واقعات سے تکلیف زیادہ پہنچتی ہے اور وہ اُس کی قدر زیادہ کرتا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بدتر حالت کبھی نہ آئیگی۔ حالانکہ حقیقتہً حالات تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ اور اُن میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کس زمانہ میں یہ مادیت نہیں تھی۔ عقائد میں مادہ رہا۔ افعال میں رہا۔ عقیدہ میں خدا کا نام زبان پر لیکن سے

خود کوزہ و خود کوزہ گرو خود گل کوزہ خود بر سر بازار خسریہ اور برآمد کیا اس کے معنی خدا کو بھی مادی ذرات بنالینا نہیں ہے۔ وہی مادہ تھا جس نے بتوں کے سامنے سر جھکوا دیئے۔ اسی مادہ کے ساتھ تعلق کا قائم ہونا۔ ان چیزوں کے ساتھ ذہن کا مانوس ہونا کوئی فلسفی حکیم ہے اُس نے نظریات کے ذریعہ سے ظاہر کیا۔ کوئی سطحی نظر والا ہے اُس نے افعال سے ظاہر کیا ہر محبوب کو دیکھ کر اُس کے سامنے جھک گئے۔ ہر بڑی چیز کو دیکھ کر اپنے سے بلند سمجھنے لگے۔ آفتاب کی پرستش کی گئی۔ ماہتاب کی عبادت ہوئی۔ ستاروں کو معبود ملا۔



اس کے مقابلہ میں دلیل بھی وہی پیش کی گئی جو مادیت کے ابطال کا ذریعہ ہے۔ یعنی یہ کہ متغیر چیز خدا نہیں ہو سکتی۔

ملاحظہ ہو حضرت ابراہیم کی بحث جس کا قرآن میں تذکرہ ہے۔

فلما جن علیہ اللیل رأى کواکبا حال هذا راى فلما اقل

قال لا احب الاقلین

”جس وقت شب طاری ہوئی ستارہ سامنے آیا کہا کہ یہ میرا رب ہے۔

جب اُس نے غروب کیا۔ کہا میں غروب کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اسی طرح چاند اور سورج دونوں کی ربوبیت کو ایک ایک کر کے

باطل کیا۔ اور اُس کے بعد کہا۔

انى وجهت وجهی للذى فطر السموات والارض حنیفاً

وما انا من المشرکین۔

”میں نے اپنا رخ پھیرا ہے اُس ایک مہستی کی طرف جس نے

آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ میں ہرگز مشرکین میں سے نہیں ہوں۔“

یہ مادیت ہی تھی جس کے پیش نظر مقدس کتابوں میں ایسی

باتیں شامل کر دی گئیں۔ جو ہرگز جلال الہی کے لئے مناسب نہیں

ہیں جیسے توریت میں حضرت آدم کے قصہ میں جس وقت انھوں

نے گہیوں کھایا۔ تمام جسم عریاں ہو گیا۔ لکھا ہے کہ آدم کو خدا ٹھنڈا ہوا



اُس باغ کے اندر دکھائی دیا۔ وہ سیر و تفریح کے لئے باغ میں آیا تھا۔ آدم کو فطرناشر مندی محسوس ہوئی۔ درخت کے اندر چھپ گئے۔ خدا نے آواز دی "تم کہاں ہو؟ آدم نے کہا میں درخت کی جھاڑی میں چھپا ہوا ہوں۔

یہ کس نے خدا کا اس طرح کا تصور پیش کرایا ہے۔ یہ وہی مادیت کے ساتھ انسان کی محبت ہے۔

اسی طرح یہ کہ حضرت یعقوبؑ رات بھر خدا نے کشتی لڑی چھتر یعقوب بھی ایسے تھے کہ رات بھر لڑائے اور کوئی مغلوب نہ ہوا۔ سب صبح قریب ہوئی تو خدا نے کہا بس مجھے اب چھوڑ دے یعقوبؑ کہا میں تو نہ جانے دوں گا۔ مجھے برکت دیا جا۔ اسی بنا پر لقب "اسرائیل" کے معنی عبرانی میں ہیں "خدا" کے۔ اور "اسرا" کے معنی ہیں قوت سے یہ مادیت ہی کے جذبات تھے جنہوں نے خدا کے لئے حلول کی اجازت دی کہ خدا مختلف جہوں میں حلول کرتا ہے نمایاں ہوتا ہے۔ درختوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ جس میں کبھی اُس نے زیارت کرا دی وہ ہمیشہ کے لئے مقدس ہو گیا۔ اس کے لئے کسی نے کہا ہے

نیست اندر جائہ ام غیر از خدا      لا اله الا انا ہا فاعبدون



”میرے ان کپڑوں میں خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ آؤ سب میری عبادت کرو۔“

یہ کلمہ ہر وہی خدا کی ہستی کو اُس کے ”تتزیہ“ و ”تقدیس“ کے درجہ سے گراتا اور نقائص سے منصف کرنا۔ ان تمام عقائد میں مادہ کی کارفرمائی تھی۔ اسی طرح افعال و اعمال سے دنیا میں ہمیشہ خدا کے انکار کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ ہمیشہ دنیا اپنے افعال سے یہ ثابت کرتی رہی کہ وہ خدا کی قائل نہیں ہے۔ وہ فرعون کی فرعونیت خدا سے انکار ہی پر مبنی تھی۔ اُس کا یہ کہنا یا ہامان ابن لی صوحا علی اطلع الی الہ موسیٰ والی لا ظنہ من الکاذبین۔

”اے ہامان! میرے لئے ایک قلعہ بنا دے۔ شاید میں چڑھ کر خدائے موٹی کو دیکھ سکوں اور میں تو انھیں جھوٹا سمجھتا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہی تصور سامنے ہے کہ خدا اگر سے تو بلندی پر بیٹھا ہوا ہوگا۔ اور قلعہ پہرے دکھائی دیگا۔ اس کے بعد خدا کے نہ ماننے ہی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کو نہ ماننے کی دعوت دے رہا ہے یہ کہہ کر الی لا اعلم لکم من الہ غیری میں تمہارے لئے کوئی خدا نہیں جانتا ہوں سوائے اپنے۔“



یہ درحقیقت اُس کے خیالات تھے جو زبان سے نکلتے تھے۔ یہ اُس کی جرات تھی کہ اُس نے اعلان کر دیا۔ ورنہ دنیا میں ہر زمانہ کے فرعون اپنے اعمال سے ثابت کرتے رہے ہیں کہ وہ اپنے تئیں خود معبود سمجھتے ہیں۔ اور دنیا والے ہمیشہ اپنے اعمال سے اس بات پر مکر کرتے رہے ہیں کہ بس آپ ہی آپ ہیں۔ اور کوئی بھی نہیں۔

یہ جذبہ جب حد سے بڑھا اور اندیشہ نہیں باقی رہا تو زبان سے ظاہر ہو گیا۔ اگر زبان سے اظہار میں اندیشہ ہوا تو عمل سے ظاہر ہوا۔ اس کے خلاف خدا کے وجود کے بارے میں گواہی ہر زمانہ میں خدا کے بنوے دیتے رہے۔ اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ دنیا کی تمام طاقتیں بیچ ہیں اُس کے مقابلہ میں۔ اور صرف ایک سستی ہے جو ان سب کے بالاتر ہے۔ آج دنیا کہتی ہے کہ آنکھوں سے جو چیز نہیں دیکھی گئی ہو اُس کا یقین کیسے ہو سکتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ آنکھوں سے نہ دیکھنے کی بنا پر وہ یقین ہوتا ہے جو دیکھنے کی بنا پر نہیں ہو سکتا۔ آنکھوں کے دیکھنے کی تمام چیزیں انسان کو روک رہی ہیں کسی اقدام سے۔ اور کوئی ایک غیبی طاقت ہے۔ وہ محرک ہے۔ انسان تمام مادی



چیزوں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اُس غیبی طاقت کے اشارے پر کام کرتا ہے۔

وہ فرعون کا دربار اور وہ آثار سلطنت۔ وہ تمام شان و شوکت اور وہ جاہ و جلال۔ اُس میں موسیٰ و ہارون دو خدا کے بندے اور وہ ایسی آزادی سے پیغام پہنچا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام چیزیں شان و شوکت کیا کچھ کبھی نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطنت جس کو آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ کوئی اثر نہیں ڈال رہی ہے۔ مگر وہ طاقت جو دکھائی نہیں دیتی ہے اُس کا احساس گہرے ہوئے ہے۔

وہ نمرود کا دربار۔ اُس میں ابراہیم۔ ابراہیم اکیلے نہ کوئی مونس نہ یاور۔ اگر اس آنکھ سے دیکھی ہوئی طاقت سے مرعوب ہوتے جس کا نام تھا نمرود۔ اور غیبی طاقت پر اعتقاد نہ رکھتے ہوتے تو کیا یہ استقلال پیدا ہوتا، مگر نہیں وہ تخت سلطنت پر کمرہا ہے کہ درحقیقت جو کچھ بھی اقتدار ہے وہ مجھ کو حاصل ہے۔ اور ابراہیم سے کہتا ہے کہ خدا کے وجود کا کیا ثبوت ہے۔ ابراہیم کہتے ہیں "ہبّی الذی یحییٰ ویمیت" میرا خدا وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ تو میرا کام ہے میں جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔



ابراہیم کہتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاتٰی بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا  
 مِنَ الْمَغْرِبِ۔ ”خدا آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا ہے  
 تو مغرب سے نکال دے۔ فہت الذی کفر“ یہ سن کر وہ بہت  
 ہوجاتا ہے۔“

یہ مقابلہ الہیات کا اور مادیات کا دنیا میں ہمیشہ قائم رہا ہی  
 ادھر دنیا والے اپنے عمل سے ثابت کرتے رہے اور اعلان کرتے  
 رہے کہ خدا کچھ نہیں۔ اُدھر خدا کے ماننے والے اپنے عمل سے  
 ثابت کرتے رہے کہ یہ دنیا کچھ نہیں۔ اور جو کچھ ہے وہ وہی ہر  
 وہ مادیت تھی جو یحییٰ کے سر پر تلوار چلا رہی تھی۔ اور وہ الکتیت  
 تھی جو یہ سمجھنے کے بعد کہ میرا قتل یقینی ہے اپنا سر پیش کر رہی تھی  
 یہ بھلا ایک موحوم چیز انسان پر اثر ڈال سکتی ہے کیا ایک وہی  
 چیز انسان کو طاقت و جبروت کے مقابلہ میں قائم و برقرار رکھتی  
 ہے؟ یہ وہی ہے جو میں کہہ رہا تھا کہ خدا کے ماننے والے خدا  
 کو ہزار حقیقتوں سے زیادہ یقینی چیز سمجھتے ہیں۔ جو شک پرگان  
 بہم پر نہیں قائم ہے۔ بے شک انکار خدا کا سرمایہ  
 لاعلمی ہے۔ مگر خدا کا اقرار علم و یقین پر مبنی ہے۔ وہ خدا کا  
 انکار تھا مادیت ہی کے نقطہ نظر سے جو ولید بن یزید بن



کی زبان سے کہلو رہا تھا۔

فقل لله یمنعنی طعانی + وقل لله یمنعنی شرابی  
(یعنی) کہو خدا سے میرا کھانا پانی، بند کر دے میں تو شراب خوار کی  
ہی میں زندگی گزار دوں گا۔

اور قرآن مجید میں جو فال دیکھی اور یہ آیت نکلی "واستفتوا  
وخاب کل جبار عنید" تو قرآن کو پھاڑ ڈالا اور یہ شعر پڑھے:۔  
اتوعد کل جبار عنید فہا ناذاک جبار عنید  
اذا ما جئت ربک یومہ فقل یا رب عزی لولید  
لکھیا تو ہر کشر اور معاند کو دکھیاں ہی دیتا ہے۔ اچھا تو دیکھ کہ میں  
کشر اور معاند ہوں۔ جب تو اپنے خدا کے پاس قیامت کے  
دن جانا تو کہہ دینا کہ مجھے ولید نے پھاڑ ڈالا تھا۔

یہ ہے انکار خدا کا مظاہرہ۔ یہی وہ انکار خدا تھا جو سالتاب  
کے مقابل میں دنیا والوں کی زبان سے یہ کہلو آتا تھا کہ جتنی دولت  
بنا ہوں لے لیجئے اور جس بڑے سے بڑے عرب خاندان میں آپ  
کہیں شادی کر دیں۔ مگر آپ پیغام توحید نہ پہنچائے۔ معلوم  
ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ سمجھتے تھے وہ دنیوی چیزوں کو سمجھتے تھے  
اس کے علاوہ اور کچھ نہ جانتے تھے۔ مگر یہ خدائی فیسی طاقت تھی



جس نے کھلوا دیا رسول کی زبان سے کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر آفتاب رکھ دو اور ایک پر مانتاب - اور مجھ سے یہ توقع رکھو کہ میں اپنے الٹی پیغام سے باز آ جاؤں تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کچھ بھی نہیں اور وہ جسے دیکھا نہیں وہی سب کچھ ہے۔ یہ کیا تھا کہ ڈھیلے پھیکے جاتے ہیں۔ پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ خون بہنے لگتا ہے۔ ذلت کی جاتی ہے۔ خود ارشاد ہوتا ہے۔

ما اودى نبی قط کما اودیت۔

کسی نبی کو اتنی تکلیفیں نہیں پہنچیں مستقل تکلیفیں، ایک انسان کے قتل کیا جانا آسان ہے۔ مگر اس طرح کی قلبی تکلیفیں سخت ہوتی ہیں۔ پھر ملاحظہ ہو کہ وہ مادیت ہی تھی جو عمر سعد کی طرف سے لوگوں کو گواہ بنا رہی تھی۔ "گواہ رہنا کہ یہ پہلا تیر ہے جو میں حسین کے لشکر پر لگاتا ہوں"۔ اور وہ خدا کا پورا عقیدہ تھا جو حسین سے کھلوا رہا تھا۔ اللہم اشہد علی ہؤلاء القوم "خداوند اس قوم پر گواہ رہنا"۔

عمر سعد صرف اس سامنے کی جماعت کو سب کچھ سمجھتا تھا اس لئے اُس نے گواہی کے لئے اُن کو پکارا۔ مگر وہ خدا کا ماننے والا کسی ایک غیبی طاقت کو حاضر سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے اپنا گواہ اُسے



قرار دیا۔ گواہیاں و دونوں کام آئینگی۔ مگر وہ دنیا میں کام آئینگی  
 جوانی ہے اور یہ آخرت میں کام آئینگی جو باقی ہے۔ وہ خدا کا  
 انکار تھا جو بھرے ہوئے دربار میں حاکم شام کی زبان سے کھلوا رہا تھا  
 این امشیانجی بیدگ شیدا جزع الخرج من وقع الابل  
 ”کہاں ہیں ہمارے وہ بزرگ جو جنگ بدر میں مارے گئے وہ آج  
 دیکھتے کہ کس طرح ہم نے نیزہ بازی و شیرازی میں کار نمایاں انجام  
 دیے۔“

لعبت هاشم باملك ولا خيم جاء ولا وحى نزل  
 ”یہ تو بنی ہاشم نے سلطنت کا ایک کھیل کھیلا تھا۔ علامہ کوئی خبر آئی تھی  
 اور نہ کوئی وحی اتری تھی۔“

لست من خند ان لم انتقم من بنی اسد ما کان فعل  
 ”میں اپنے باپ دادا کی اولاد سے نہیں اگر احمد کی اولاد سے بدلہ لوں  
 اس کا جو انھوں نے بدر واحد میں کیا تھا۔“

اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ دنیا ہی  
 جو کچھ ہے وہ اسی دنیا کا اقتدار ہے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی اعمال و  
 افعال کا محرک ہے وہ وہی حیوانیت۔ انتقام ہوس طمع لالچ  
 ان ہی سب کے ماتحت سب کام کئے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ



کوئی چیز ہی نہیں جو محرک عمل ہو۔ لیکن وہ کہ جو خدا کے ماننے والے  
 تھے انہوں نے دکھلا دیا کہ سلطنت کوئی چیز نہیں۔ حکومت کوئی چیز  
 نہیں اقتدار کوئی چیز نہیں۔ اعزاز کی محبت کوئی چیز نہیں۔ اولاد کوئی  
 چیز نہیں۔ عزت کوئی چیز نہیں۔ آبرو کوئی چیز نہیں جو کچھ ہے وہ  
 وہی ہے جو سب کا خالق ہے۔ جو سب کا پیدا کرنے والا ہے۔  
 آج مادی دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہئے کہ کس کا نقطہ  
 نظر تھکا اور کس کا غلط۔ یعنی وہ مادی قصر جو سلطنت کی چوٹیوں  
 پر قائم کئے گئے تھے۔ جو حکومت کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے۔ وہ  
 سلطنتی اقتدار جو دنیا کے بھر دے پر قائم تھا۔ وہ دنیا میں کتنا  
 طاقتور رہا اور کتنے دن اُس کو بقا رہی۔ اور وہ خیال جو مادی  
 نقطہ نظر سے لائے پر مبنی تھا۔ اُسے دنیا میں کتنا ثبات و استقلال  
 حاصل ہوا۔

آج وہ قصر ملیا میٹ ہو گئے۔ لیکن وہ خدائی قصر دنیا میں اس  
 طرح نمایاں ہوا کہ اقوام عالم اُس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اُس  
 کی عظمت کا احساس کرتے ہیں۔ اور یہی خاص پہلو ہے واقعہ کربلا  
 کا جس کی بنا پر میں کہتا ہوں (اور یہ کوئی فرقہ وارانہ سوال نہیں  
 ہے) کہ ازل سے لیکر اس وقت تک مذہبیت اور مادیت الہیت



اور دنیا داری کے درمیان ایسی جنگ کبھی نہیں ہوئی تھی اور نہ سب کو اتنی بڑی فتح دنیا کی طاقتوں کے مقابلہ میں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی بڑی فتح واقعہ کر بلا میں حاصل ہوئی اور اس لئے دنیا کے جتنے اہل مذہب ہیں خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اُن کو غمہ، احساس کی قوت دکھلا دینے کے لئے واقعہ کر بلا کی یادگار قائم کرنا چاہئے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مادیت کے مقابلہ میں عملی کامیابی جیسی کر بلا میں حاصل ہوئی۔ اُس کی مثال دنیا کے یردہ پرناپید ہے۔ اگر یہ دنیا ہی کوئی چیز ہے۔ اور اس کی مادی طاقتیں ہی سب کچھ ہیں۔ تو کیا حسنین کے شانے میں کوئی کسر بھی رہ گئی تھی؟ اور کیا نزدیک کی فتح و ظفر میں کوئی کمزوری سمجھی جاسکتی تھی؟ مکمل کامیابی! مگر وہ آنکھوں سے نہ دیکھی ہوئی طاقت ہے جس نے فنا کو فنا بنا دیا موت کو حیات بنا دیا۔ وہی جو مٹ گیا تھا ہمیشہ کے لئے باقی رہا اور وہ کہ جو کامیاب ہوا تھا ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔ وہ جن کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ آج اُن کی طرف نسبت رکھنے والے شرماتے ہیں منسوب ہونے سے۔ اور وہ جو مٹا دیے گئے تھے۔ جن کا نام لینا حرم تھا۔ آج اُن کی طرف غلط نسبت دنیا بھی فخر سمجھا جاتا ہے۔ جا کر دیکھ لیجئے دمشق کے قصر حکومت کو اور تاجدار دمشق کی آخری خواب گاہ کو



یہ کیا ہے کہ کوئی زبان سے خواہ کسی مصلحت سے ان لوگوں کو اچھا  
 کہے لیکن وہاں جا کر خود ضمیر اجازت نہیں دیتا رخ کرنے کی۔ متوجہ  
 ہونے کی لیکن وہ کہ جسے دنیا نے مٹا دیا تھا۔ اور اُس کے ساتھ اُن  
 حقوق کو بھی نظر انداز کر دیا تھا جو ہر مسلمان کو ہر مسلمان پر حاصل ہیں  
 جا کر ذرا دیکھ لیجئے اُس نے جھگل کو کا شانہ بنا دیا۔ سنسان میدان  
 اور رتیلی زمین جو آج دنیا کا قبلہ مقصود بنی ہوئی ہے۔ شاہان  
 دنیا کے سر خم ہوتے ہیں اور سلاطین عالم کے دل متوجہ ہوتے ہیں۔ میں  
 تو کہتا ہوں یہ ہمیشہ کے لئے مادیت اور روحانیت کی جنگ کا ایک  
 فیصلہ ہے جو آپ کے سامنے ہے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے  
 محفوظ ہے اور آپ اُس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ مادیت میں کتنی  
 طاقت ہے اور روحانیت میں کتنی قوت ہے۔

## معرفت خدا کا عملی نتیجہ

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ خدا کا وجود ہے۔ اور یہ اقرار کرنے کے ساتھ  
 کہ ہمارا خالق اور ہمارا پیدا کرنے والا غیر بشعور مادہ نہیں ہے۔ بلکہ  
 ایک صاحب ارادہ و اختیار ہستی ہے جو علم و اطلاع بھی رکھتا ہے  
 حاضر و ناظر بھی ہے۔ ان سب کو سمجھنے کے بعد ہم کو کیسا انسان ہونا



چاہئے؛ یعنی وہ لوگ کہ جو خدا کو سمجھتے ہی نہیں منکر ہیں اُس کے وجود کے۔ وہ جو کچھ بھی کریں آپ کو اُن سے کسی مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اُن کے لئے حکمراں۔ اُن کے افعال میں بنی عائد کرنے والا سوائے اُن کی طبیعت اور خواہش کے کوئی چیز نہیں ہے۔ تو اب جو کچھ بھی وہ طریق کار اپنے لئے اختیار کریں۔ آپ کو کوئی اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے۔

لیکن ہمیں یہ سمجھ لینے کے بعد کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارے اوپر کوئی ہستی ہے جو ہمارے افعال کی نگران ہے۔ اس کے بعد ہم کو اپنے افعال و اعمال میں کن صورتوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ اور کیا ہمیں بھی وہی مطلق العنانی زیبا ہے جو دوسروں کو ہے یا اعتقاد کا اثر ہمارے عمل میں نمایاں ہونا چاہئے۔ یاد رکھئے اگر یہ نہیں ہے تو اعتقاد بیکار ہے۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا اعضا و جوارح دل کے تابع ہیں۔ اگر افعال تصدیق نہیں کرتے ہیں تو سمجھنا چاہئے کہ اعتقاد رسمی حیثیت سے ہے۔ دماغ میں ایک توہم اور تخیل کی طرح جگہ کئے ہوئے ہیں لیکن اُس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ پھر کیا یہ واقعہ ہے کہ ہر خدا کا نام لینے والا اپنے عمل سے جی ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر آپ غور کیجئے



ان افعال و اعمال پر جو مذہب کے نام لینے والوں سے سہ زد ہوتے ہیں تو یہ معلوم ہو گا کہ خدا کا نام تو ہے زبان پر۔ گویا ہر ایک کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ اہل مذہب کا طرز عمل ہی ہے جس نے مادیات کو یہ کہنے کا موقع دیدیا کہ اہل مذہب کا طرز عمل ہم کو مذہب سے متفر بناتا ہے۔ بہر حال مخالف کی زبان سے نکلی ہوئی بات بھی اگر سچ ہے تو قبول کرنا چاہئے یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں اہل مذہب اپنے اپنے طرز عمل سے مذہب کو ایسی صورت پر پڑ نام کیا ہے کہ جس کے بعد مذہب کی حقانیت ہزار پردوں میں مخفی ہو گئی ہے۔ کون سی وہ سیاہ کاری تھی جو مذہب کے نام پر نہیں کی گئی ہے اور کون سی وہ خدا کی معصیت تھی جو خدا کے نام کا پردہ ڈال کر عمل میں نہ لائی گئی ہو۔ ہم زبان سے اگر خدا کا نام لیتے ہوں اور خدا کا اقرار کرتے ہوں۔ اور دلائل سے اُس کو ثابت بھی کر دیں۔ مگر ہم اپنی اعمال سے اُس کے خلاف کرتے ہوں تو ہمیں کیا حق ہے کہ ہم دوسروں کو اُس کے ماننے کی دعوت دیں۔ خدا کے اقرار کا نتیجہ ہونا چاہئے کہ انسان کے افعال میں انضباط پیدا ہو۔ یعنی جتنے زندگی کے شعبے ہیں اُن پر اثر پڑے۔ بہت چیزیں وہ ہیں جو خدا سے براہ راست متعلق ہیں یعنی وہ جنہیں عام طور پر عبادت کے



نام سے بغیر کیا جاتا ہے جیسے نماز و روزہ وغیرہ۔ اور کچھ وہ چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے تعلقات معاشرت کی صورت میں وابستہ ہیں۔ ہماری عبادت۔ اس کو اگر ہم غور کریں تو ایک عادت ہے لیکن عبودیت کی روح اُس میں نہیں ہے۔ خدا بھلا کرے ماں باپ کا جنھوں نے ہمیں عادت ڈال دی اس لئے پابند ہیں۔ مگر خود غور کر کے اس کی اہمیت کا احساس کریں ایسا نہیں ہے۔ اور یہ آج کل کے موجودہ بچوں میں جو عام طور پر ان فرائض کے ادا کرنے سے بے توجہی پائی جاتی ہے۔ اس کی ذمہ داری یقیناً ماں باپ پر عائد ہے۔ حقیقتہً احساس مذہب کی حیثیت سے زیادہ فرق نہیں ہے۔ اُن نوجوان بچوں میں اور ضعیف ماں باپ کے طرز عمل میں۔ مگر ان ضعیف ماں باپ کے آؤ بچے نے عادت ڈال دی تھی اور خود ان ماں باپ نے اپنے بچوں کو عادت نہ ڈالی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اپنے فرائض کا احساس نہیں کیا۔ اگر کیا ہو تو اپنے بچوں کو ان چیزوں کا پابند بنانے کی انتہائی کوشش کرتے ہم دیکھتے ہیں کہ خود اُن کی تو ایک وقت کی نماز مانگہ نہیں ہوتی مگر صاحبزادوں سے جھوٹوں بھی نہیں کہتے کہ یہ کیا ہے۔ یہ بچے قابل الزام ہیں۔ مگر ان سے زیادہ اُن کے والدین قابل الزام ہیں



یعنی اپنی کوئی بات ہو اور ذرا بھی دیر ہوئی تو بگڑ جائیں گے۔ لیکن خدا کے فرض کی اہمیت نگاہ میں اتنی بھی نہیں ہے جتنی اپنے معمولی کاموں کی۔ یعنی کوئی اپنے بچہ سے پانی مانگے اور دیر کرے تو خطگی ہوگی لیکن فرائض الہیہ کی بجا آوری میں اگر کوتاہی ہوئی تو کوئی توجہ نہیں۔ پھر خود اپنی نماز۔ میں سچ کہتا ہوں جس طرح کی ہوتی ہے اس کو ہر شخص خود ہی جانتا ہے۔ صحت اور چیز ہے اور قبولیت دوسری چیز صحت کے معنی ہیں قانون کے الفاظ کے مطابق رسمی حیثیت سے عمل کو بجالانے آنا۔ اس میں مثلاً رکوع، سجود، قیام، فعود ہونا چاہئے۔ اگر ان شرائط کو پورا کر دیا۔ تو میں کہوں گا کہ صحیح ہو گا نماز۔ لیکن یہ کہ اُس میں واقعات رجوع قلب تھا یا نہیں۔ اس میں توجہ تھی یا نہیں۔ اس میں عمل کی اہمیت کا احساس تھا یا نہیں یہ چیزیں صحت عمل سے بالاتر ہیں اس کو کہا جاتا ہے قبولیت۔ ہمارا عمل شاید صحت کے درجہ پر پہنچ جاتا ہو۔ لیکن یہ کہ حقیقتہً رجوع قلب جو روح عبادت ہے وہ ہمارے عمل میں کہاں۔ اس لئے کہ اُس کی بنیاد تو اس پر ہے کہ جس کی عبادت ہو رہی ہے اُس کا صحیح تصور ہو خداوند عالم کا اگر یقین کامل ہو تو اس کا لازمی نتیجہ ہو گا کہ عبادت بھی ویسی ہی ہو۔



اسی لئے امیر المومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے۔  
 اعبد ما قبلک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فہو براک۔  
 ”خدا کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا اُس کو دیکھ رہے ہو۔ اور  
 اگر تم اُسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے۔“  
 اگر یہ چیز انسان کے پیش نظر ہو تو حقیقتہً وہ عبادت ہو جس کی  
 مثال آپ کے سامنے روایات میں پیش کی گئی ہے کہ پیر سے تیر کھینچا جا  
 اور احساس نہ ہو۔ یہ نتیجہ ہے اُس تصور کا کہ ہم کس کے سامنے  
 کھڑے ہیں۔ جتنا یہ تصور زیادہ ہوگا اتنا ہی عمل میں کمال پیدا  
 ہوگا۔ ہمیں جس وقت کہ وضو کے لئے پانی آتا ہے عام طور پر  
 کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن وہ کہ جو حقیقت سے اُس کی واقف تھے  
 ادھر وضو کے لئے پانی سامنے آیا چہرہ کا رنگ تغیر ہو گیا کسی نے  
 پوچھا تو جواب دیا کہ تم کو نہیں معلوم کہ کس کی بارگاہ میں حاضری  
 کا وقت آ رہا ہے۔ یہ اُس کی عظمت کے احساس ہی کا نتیجہ ہے  
 کہ چاہے انسان کتنا ہی نیکو کار ہو مگر اُس کی بارگاہ میں اپنے  
 نہیں ہمیشہ کوتاہ دست سمجھتا ہے۔ ہم اگر شب قدم میں بیدار رہی  
 کبھی عبادت زیادہ کی تو ناز ہے اس پر۔ سمجھتے ہیں کہ ہاں!  
 ہم نے عبادت کی۔ لیکن وہ جو حقیقتہً عبادت کرنے والے تھے



بہشتہ اپنے تئیں قاصر سمجھتے تھے۔ اس لئے جب اُس کی بارگاہ میں آئے تو گناہ کا اقرار۔ وہ تڑپ اور بچینی جو حقیقی گناہ کے حواس میں بھلتی ہے۔

صحیفہ کاملہ میں امام زین العابدین کی دعاؤں کو ملاحظہ کیجئے اُن کے الفاظ کی نقل ہے جو نہ معلوم کتنے واسطوں سے نکل کر ہم تک پہنچی ہے۔ لیکن اب تک اُن کو پڑھ کر دل ہل جاتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

امیر المومنین کا مہراب عبادت کے اندر رات کی تاریکیوں میں وہ عالم جسے ضرار نے معاویہ کے دربار میں بیان کیا کہ:-  
یتملل تملل السليم ويسكى بكاء الشكى ويقول ااه من  
قلعة الزاد وبعد السفر.

”مثل مارگزیدہ ٹپتے تھے اور مثل زن سپر مردہ روتے تھے اور کہتے تھے ہائے افسوس زاد راہ اتنا کم اور سفر اتنا طولانی۔“  
یہ آپ سے جو کہا گیا ہے کہ ”صراط“ بال سے زیادہ باریک ہے۔ تو کیا مادی حیثیت سے۔ یہ درحقیقت اُس راہ کی دشواری کا اندازہ کرانا ہے بحسب الفاظ میں۔ کہ اس راستہ کو بالکل معمولی راستہ نہ سمجھو۔ بلکہ یہ اتنا دشوار گزار راستہ ہے۔ آپ کو کبھی



اتفاق ہوا ہو کسی حاکم سے ملاقات کو جانے کا۔ بہر حال وہ بھی ایک آدمی ہے۔ مگر کسی حیثیت سے اُس کی بزرگی دماغ میں راسخ ہو گئی ہو نورات بھر ایک الجھن رہی کہ کل کیا صورت پیش آتی ہے۔ اگرچہ آپ مجرم نہ ہوں۔ ملاقات کے طور پر اعزازی صورت سے آپ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن جب تک کہ آپ ملاقات کر نہ لیں۔ اُس وقت تک ایک خاص پچھنی رہے گی۔ اس لئے کہ آپ اُس کی شخصیت کو دماغ میں جگہ دیے ہوئے ہیں۔ تو آپ یقین کر لیجئے کہ خدا کی عظمت کا جن کو صحیح احساس ہے۔ وہ اُس کے رضا مند رکھنے کے فرض کو اس طرح پر ادا کرتے ہیں جو اُس کے شایان شان ہے۔ ان کو یہ احساس کبھی نہیں ہوتا تھا کہ عمل میں کتنی مشقت ہے۔ بلکہ وہ دیکھتے تھے کہ عمل اُس کی شان کے لائق کیونکر ہو گا۔ اُس کی شان اتنی بڑی معلوم ہوتی تھی کہ اپنا عمل اُس کی شان کے لائق نظری نہ آتا تھا۔

اب رہا دوسرا شعبہ جو حقوق الناس سے متعلق ہے اس میں اگر خدا کے وجود کا صحیح تصور انسان کو ہو تو کیا ممکن کہ کسی کے ساتھ زیادتی ہو جائے۔ درحقیقت عدالت، مساوات، انصاف سب چیزیں مبنی ہیں اس پر کہ خدا کا عقیدہ ہو۔ لیکن اگر خدا کا



اعتقاد زبان پر ہے اور اُس کے ساتھ انسان دوسروں کے حقوق پر غاصبانہ تصرف کرتا ہے۔ دوسروں کے کسی جائز حق کو ادا نہیں کرتا تو ایسا انسان ہرگز خدا کو دل سے نہیں مانتا ہے۔ کیا یہ سب کچھ ممکن ہے اگر وہ یہ سمجھتا ہو کہ خدا حاضر و ناظر ہے؟ انسان کی خصلت ہے کہ جب کوئی جرم کرے گا تو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہونے کی کوشش کرے گا۔ لیکن یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ کوئی اور بھی دیکھنے والا ہے۔ اس کا قرآن مجید میں تذکرہ کیا گیا ہے:-

يَسْتَحْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُمْ مَعَهُمْ  
 "یہ لوگ جس وقت کہ کوئی معصیت کرتے ہیں تو آدمیوں سے چھپتے  
 ہیں مگر خدا سے چھپنے کا کوئی احساس نہیں ہوتا حالانکہ وہ اُن  
 کے ساتھ ہے۔"

مشہور ہے کہ جس وقت یوسف معرض امتحان میں تھی وہ ایک سخت امتحان تھا نفس کا جہاں دنیا کے کمزور ارادہ والے دھمکا جائیں۔ وہ زیچا کا مکان اُس کی چار دیواری اور اُس کا قہر و جبر۔ اس وقت یوسف کی نظر پڑی دیکھا کہ ایک گوشہ میں پردہ پڑا ہوا ہے۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ کہا کہ صنم ہے جس کی میں



پرستش کرتی ہوں مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ اس پر پردہ نہ ہو۔ میں نے  
 اس پر پردہ ڈال دیا۔ یوسف نے کہا کہ تمہارا معبود وہ ہو گا جو  
 پردہ ڈالنے سے چھپ جائے۔ مگر میرا معبود تو ایسا ہے کہ ہزاروں  
 پردوں سے بھی نہیں چھپتا۔ پھر میں اُس کا خیال کیسے نہ کروں۔ تو  
 انسان اگر حقیقی اعتقاد خدا کا رکھتا ہو تو یہ کیا کہ جس سے ذرا سا اندیشہ  
 ہوتا ہے اُس کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔ مگر اُس کی کوئی  
 بہ وہ نہیں تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ واقعی انسان خدا کو مان  
 رہا ہے۔

ہم اُس وقت تک بہت خدا پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں جب  
 ہماری کسی غرض سے تضادم نہیں ہوتا اور ادھر کوئی غرض دنیاوی  
 ہمارے سامنے آئی۔ چاہے وہ ایک معمولی سا فائدہ کیوں نہ ہو۔  
 ادھر ہم فرض کے احساس کو بھول گئے ہمیں پھر خبر نہیں ہوتی  
 کہ ہمیں کرنا کیا چاہئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم منافع کو بہت سمجھتے ہیں  
 اور جو اُس کے مخالف طاقت ہو اُس کو کچھ نہیں سمجھتے۔ ہم کہتے ہیں:-

ایاک نعبد وایاک نستعین

”بارالہا۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد حاصل کرنا  
 چاہتے ہیں۔“



اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیاوی طاقت سے زیادہ بھروسہ ہے اُس کی طاقت پر۔ مگر ہمارا عمل بتلاتا ہے کہ ذرا سی بات پڑ جاتی ہے تو دنیا کے دلی نعمت اشخاص کو ہم اس طرح قبضہ حاجات سمجھ لیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہمارا رزق صرف ان ہی سے وابستہ ہے۔ اگر یہ ہاتھ کھینچ لیں تو ہمارا دینے والا کوئی نہیں ہے۔ اور وہ کہ جو خدا سی پرورش کرتے ہیں وہ بھی سمجھتے ہیں کہ اب اس غریب کو ہماری بندگی اختیار کرنا چاہئے ہر بات میں جانتی ہیں کہ پابند رہے۔ چاہے ہمارا طرز عمل صحیح ہو یا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ نہ اُس دینے والے کے دل میں ہے کہ ہمارے سوا کوئی ہے۔ نہ لینے والے کے دل میں ہے کہ اس کے سوا کوئی اور بھی ہے۔

یہ کیا ہے کہ ذرا سی ہلکوبھلائی حاصل ہوئی۔ ہم سفید پوش ہوئے۔ اور ایک غریب میلے کپڑے پہنے ہوئے آگیا تو یہ بات ہم کو ناگوار معلوم ہوئی کہ ہمارے پاس بیٹھے۔ صدر محفل میں آگیا تو دھکا دیکر اٹھا دیا کہ یہ تیری جگہ نہیں ہے۔ یہ جگہ کس نے مقرر کی؟ یہ نتیجہ اس کا ہے کہ آپ کو اُس خالق کا احساس نہیں ہے جس کے آپ سب بندے ہیں۔ یہ تو



سب باتیں ہمارے دماغ میں وہی پیدا ہوئیں جن کی بجائے ہماری ہمت  
 نے کی تھی۔ ہمارے اسلام نے جن چیزوں کو دنیا سے اٹھا دیا تھا  
 اُسی کے ہم پابند بن گئے۔ ہندوستان میں جہاں یہ چیزیں پہلے سے  
 رائج تھیں ہمارے یہاں بھی پیشوں کے اعتبار سے چھوت چھات پیدا  
 ہو گئی۔ طرز معاش میں ہمارے تفریق قائم ہو گئی۔ ایک ہتر چاہے  
 کتنا ہی وہ نہاد ہو کر صاف کپڑے پہن کر آئے غیر ممکن ہے کہ ہم  
 اُس کو اپنے پاس بٹھنے کے لئے جگہ دے سکیں۔ یا ایک گلاس میں  
 پانی پی سکیں۔ ہماری تیوریوں پر بل آجائیں گے۔ ہم سمجھیں گے  
 کہ ہماری شان گھٹ گئی۔ یہ ہم کو اپنی شان کا احساس۔ اور  
 اُس کی شان کی پستی کس لئے نظر آئی چونکہ اُس کا پیشہ ایک  
 ذلیل پیشہ ہے اس لئے ذات بھی ذلیل ہو گئی حالانکہ وہ بھی  
 اُسی کا مخلوق ہے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ اس کا ذکر کیا ہے  
 ایک وہ شخص جو ہمارا خدمتگار ہو گیا ہے جس کو ہم نے چھ روپیہ۔  
 سات روپیہ۔ آٹھ روپیہ۔ دس روپیہ پر ملازم رکھ لیا ہے۔ اس  
 کے ہم روادار نہیں ہیں کہ ہمارے پہلو میں بیٹھ جائے حالانکہ اگر  
 ہم غور کریں تو وہ ہمارے ساتھ ایک برابر کی حیثیت رکھتا ہے۔  
 یعنی ہمارا اذیر ہے۔ ہمارا ایک کام اُس کے ذمہ ہے۔ اُس کا



روپیہ ہمارے ذمہ ہے۔ وہ ہمارا قرضدار کام کا۔ ہم اُس کے قرضدار مال کے۔ تو نفوق اس میں کہاں سے ہو گیا۔ وہ کام کرتا ہے۔ اپنی محنت کا لیتا ہے۔ پھر اگر ملازمت کی حیثیت سے دیکھئے تو

ایک ہزار روپیہ پانے والا پروفیسر بحیثیت پابندی کے اس میں اور اُس میں کیا فرق ہے۔ یہ بھی نوکر وہ بھی نوکر۔ اس کے ذمہ بھی ایک کام ہے اُس کو انجام دیکر مزد کا مستحق ہوتا ہے۔ اُس کے ذمہ بھی ایک کام ہے معلم اس کی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اُس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہماری نظر ان چیزوں کی حقیقت پر نہیں جاتی۔ یہ تفریقیں اس لئے قائم کی گئیں کہ ہمیں صحیح حساب نہیں ہے اُس واحد قوت کا جو ہم سب پر یکساں بندی رکھتی ہو۔ ”تعمیر انسانیت“ میں میں نے تفصیل سے بیان کیا تھا کہ توحید

خدا کا اتنا احساس اور اتنا زور اس پر۔ اور اس میں تمہیں اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ تم تمام عالم انسانیت میں ایک متحدہ رشتہ کا احساس کرو۔ وہ دوسرے مثلاً نصاریٰ تھے جن کی نگاہ میں خدا کو بنی اسرائیل کا خدا کہا گیا ہے۔ جہاں بھی اُس سے تعبیر کی گئی ہے بنی اسرائیل کا خدا کہا گیا ہے۔ کہیں ہمارا باپ کہا گیا ہے۔ قرآن مجید نے ان کی ترجمانی کی ہے کہ وہ کہتے ہیں:-



فخراً بناء اللہ واحباؤہ " ہم خدا کے پیارے اور چہیتے ہیں۔  
اس کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان یہ کہتے کہ ہمارا خدا اور ہم اُس کے محبوب  
لیکن یہ نہیں کہا گیا بلکہ یہ کہا گیا :-

”بننا ورتکم لنا اعمالنا وکم اعمالکم۔“ وہ ہمارا بھی رب ہے  
اور تمہارا بھی رب ہے۔ جو جتنی اس کی اطاعت کرے گا اتنا ہی زیادہ  
عزت کا مستحق ہوگا۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم سب کو ایک نگاہ سے دیکھتے۔ مگر ایسا  
نہیں ہوتا۔ اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جائے۔ کسی بڑے آدمی کے لحاظ  
سے تب تو ہم شاید معافی مانگنے کو تیار ہو جائیں گے لیکن اگر کسی  
وقت ہم سے کوئی بے انصافی ہو گئی کسی سست انسان کے لئے۔  
جس کو ہم نے سست قرار دے لیا ہے تو چاہے ہم بعد کو سمجھ بھی  
لیں کہ ہم نے برا کیا۔ ہم نے غلطی کی۔ لیکن یہ ہماری شان خود داری  
کے خلاف ہوگا کہ ہم اُس غلطی کا اقرار کریں۔ بلکہ ہم اُسی کو منوانے  
کی کوشش کریں گے کہ وہ ہی غلطی پر تھا۔ ہم کہیں گے کہ مصلحت  
کا تقاضا یہی ہے۔ یہ کس لئے۔ میں صحیح کہتا ہوں کہ یہ بڑا عظیم  
ہے۔ انسانوں کے آپس کے حقوق جو ایک دوسرے پر ہیں۔  
یعنی ایک وقت کی ناز نہایت عظیم۔ یہاں تک کہ ترک کرنے کو



کہا گیا کہ کفر کے فریب۔ مگر ایک حیثیت سے وہ آسان۔ اور اگر ایک پیسہ کی غلط طریقہ پر ہماری جانب آگیا یا ایک ذرا سی بات جس کی وجہ سے ہماری طرف سے کسی کو شکایت پیدا ہو گئی اور کسی کا دل ٹوٹ گیا۔ یہ انتہا سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ اس کو خداوند عالم نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے کہ :-

لا یسعی ارضی ولا سمائی ولكن یسعی قلب عبدی ملو<sup>من</sup>  
 "میری سمائی آسمان و زمین میں نہیں ہے۔ لیکن اپنے مومن بندے کے دل میں میری سمائی ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی کے دل کو آزار پہنچانے سے اس لئے کہ دل میں خدا کی منزل ہے۔ وہ ایک مخلوق کی دل آزاری سے اپنی تکلیف سمجھتا ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے جو یہ بتلایا گیا کہ خدا اپنے گناہ جو براہ راست اس سے متعلق ہیں معاف بھی کر دیتا ہے مگر جو ایک دوسرے کے آپس کے گناہ ہیں وہ معاف نہیں کرتا۔ جب تک خود جس کا جرم ہے معاف نہ کرے۔ اب یہ کتنا مشکل مرحلہ ہو گیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ کسی کریم سے سابقہ پڑنا آسان ہے۔ اور اپنے ایسے تنگ ظرفوں سے سابقہ پڑنا دشوار ہے۔ وہ وہی ہے جو مغفرت کے



بہانہ ڈھونڈتا ہے اور ہم وہ ہیں کہ جو انتقام کے لئے بہانے تلاش  
 کرتے ہیں ایک دوسرے کی دل آزاری کرنا اور تکلیف پہنچانا بڑا  
 گناہ ہے۔ لیکن میں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ ہم ممکن ہے کہ اپنے  
 کو بڑا نہ اہم سمجھتے ہوں۔ محراب عبادت میں نماز شب پڑھتے ہوں۔  
 ہر وقت زبان پر ذکر الہی جاری رکھتے ہوں۔ اور خدا کی عبادت  
 بہت زیادہ کرتے ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتنے دلوں کو ہم نے  
 رنجیدہ کیا۔ کتنے لوگوں کو تکلیف پہنچائی۔ کتنوں کو نقصان پہنچایا  
 کتنے حقوق تلف کئے۔ اس کا کبھی احساس نہیں ہوتا۔ گویا یہ  
 چیز عبادت کے مفہوم سے خارج ہے۔ حالانکہ آپ ملاحظہ فرمائیے  
 قرآن مجید میں آپس کے حقوق اور تعلقات کے درست رکھنے کے لئے اتنے  
 واضح بیانات۔ اتنی تاکیدیں کی گئی ہیں جتنی کسی اور چیز کے لئے نہیں کی  
 دنیا میں آپس میں معاشرت کے درست کرنے کے لئے آپس کے تعلقات  
 بڑھانے کے لئے ایک پس پشت دوسرے کی برائیاں کرنا دوسرے کے  
 عیوب تلاش کرنا۔ دوسروں کی نکتہ چینی کرنا۔ دوسروں کی دل آزاری  
 کرنا۔ ان تمام باتوں کو انتہائی مہنوع قرار دیا گیا۔ اذیت دینا کسی ایک  
 مومن کے نفس کو مستحق بنانا ہے لعنت کا خدا کی بارگاہ میں۔ تعلقات  
 قائم کئے گئے تھے تمام لوگوں کے درمیان میں کہ ہر ایک دوسرے کا اتمام



کرے عزت کرے۔ اور جس طرح انسان کو خود یہ پسند نہیں کہ اس کے  
عیوب نمایاں ہوں اس طرح اس کو یہ کیا حق ہے کہ وہ دوسرے کے راز فاش  
کرے۔ دنیا میں منافرت اور تضاد یہ چیزیں جو پیدا ہوتی ہیں اس کی  
نہیں منزلیں ہیں۔ پہلی منزل ہے بدگمانی کا پیدا ہونا۔ دوسری منزل یہ ہے کہ  
بدگمانی کے بعد تنجو ہو نقص اور عیوب کی تیسری منزل یہ ہے کہ ان عیوب کا  
تذکرہ ہونے لگے۔ اگر ان میں سے ہر چیز اپنی جگہ پر ختم ہو جائے تو کبھی فساد  
نہ برپا ہو۔ قرآن مجید نے ہر منزل پر پرے مقرر کئے۔ سب سے پہلے یہ کہنا۔  
اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔ دیکھو زیادہ گمان پر عمل کرو  
بہت سے گمان ایسے ہوتے ہیں کہ بالکل گناہ ہوتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے خلنوا بالمومنین خیرا۔ آپس میں ایک دوسرے پر  
اچھا گمان رکھو۔ یہ کہا گیا کہ اگر تانوں پہلو کسی بات میں برائی کے ہوں  
اور ایک پہلو بھی اچھائی کا ہو تو ہمیشہ اس کے عمل کو اس اچھائی  
کی طرف محمول کرو۔ اس کے بعد اگر یہ گمانی پیدا ہو جائے تو پھر ارشاد ہوا۔  
ولا تجسسوا۔ ایک دوسرے کے عیوب کی جستجو نہ کرو۔ فکر میں نہ پڑو۔  
ہمارا یہ طریقہ کہ اگر ذرا جھنگل گئی کسی کے عیب کی تو ایک دوسرے سے  
دریافت کر رہے ہیں۔ تیسری منزل یہ ہے۔ ولا یفتب بعضکم بعضا المحب  
احداکم ان یا کل لحم اخیه میتا فکرمھو۔ ایک دوسرے کی اس کے



پیٹھ پیچھے برائی نہ کرو۔ کیا تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ اپنے ایک مردہ بھائی کا گوشت کھائے تم سب اس کبریٰ نظر سے دیکھو گے۔ اس کا مطلب یہ کہ مردہ قوت مدافعت نہیں رکھتا اسی طرح جو سامنے نہیں ہو وہ غیبت کی وجہ سے صفائی نہیں دے سکتا۔ اس لئے آپ جو اس کی پیٹھ پیچھے برائی کر رہے ہیں یہ ویسا ہی ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھایا جائے مگر ہماری دلچسپی کا وسیع ہے اور دل دینے کا سبب ہے ایک دوسرے کے عیب کا بیان کرنا۔ ان پر صبر کرنا یہ ہمارا دیکھنا ہے۔ ہم سے جو کچھ کما گیا تھا اس کے خلاف کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ بعد کی منزلیں تو بہت دور ہیں۔ امت رسول اس بات پر نازاں ہے کہ ہم امت مرحومہ ہیں۔ نجات کے ضرور مستحق ہیں اس کے بعد امت مرحومہ میں بھی ہماری جماعت کیونکہ بہتر فرقے ہیں ہر ایک خیال کرتا ہے کہ ہم ناجی ہیں۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

ستفرق امتی علی ثلث وسبعین فرقۃ کلہم فی الدار الا کا  
 عمران سب کی بنیاد پر ایمان بخدا اگر ہماری اعمال و افعال یہ نمائش کر رہی ہیں کہ ہم خدا ہی کو کچھ نہیں سمجھتے تو اس کے بعد نجات کیسی۔ اہلبیت رسول کی طرف رشتہ داری کیسی کیونکہ سب رشتہ تو خدا ہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان رشتوں میں جو عظمت پیدا ہوتی ہے وہ خدا ہی کے لحاظ سے۔ اگر اس کو نکال دیا جائے تو رسول ہیں بحیثیت ایک مادی انسان کے کیا عظمت تھی پھر خدا کی



وجہ سے اُن میں عظمت پیدا ہوئی۔ ورنہ ظاہری عظمت کے ذرائع تو ایسے  
 تھے کہ جنہیں دنیا نے سلب کر لیا تھا۔ ماہ و دولت شان و شوکت سے لاپیت  
 رسول اور خود رسول الگ تھے تو اس حیثیت سے تو قیصر و کسریٰ میں عظمت تھی  
 پھر اُن کو عظمت پیدا ہوئی تو وہ خدا ہی کی وجہ سے۔ یعنی خدا کے یگانہ  
 تھے۔ اس لئے قابلِ عظمت ہیں۔ خدا کی صحیح تعلیم کے مروج تھے اس لئے اُن کی عظمت ہے  
 مگر جب ہمارے دل میں خدا ہی کی عظمت نہیں ہے تو پھر اُس کی طرف نسبت  
 کھنے والوں کی کیا عظمت ہو سکتی ہے اب اگر خدا کی عظمت کا صحیح احساس ہے  
 تو اس کے کیا معنی کہ خدا کی عبادت میں کوتاہی۔ اس پر یہ غرہ کہ ہم نجات ضرور  
 پائیں گے۔ خدا کی عبادت پر محکم۔ یہ چیز اس وقت بہت شائع ہے خصوصاً  
 جو نئی عمر کے لوگ ہیں اُن میں یہ بہت کافی موجود ہے کہ اگر فرائض کا خدا  
 کے ذکر ہو تو اُن کی زبان سے کوئی تسبیح کا لفظ نکل جائے لیکن اس کے  
 بعد وہ کہیں گے کہ ہم خدا کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہ جو کچھ کہا جا رہا تھا مذاق میں تھا  
 مگر یاد رہے کہ جب ذہن میں کسی کی عظمت کا احساس ہو تو زبان سے تسبیح کی کوئی  
 بات اُس کی نسبت نکل ہی نہیں سکتی۔ یہ طرافت خود ترجمانی کرتی ہے کہ ذہن میں  
 اُس کی عظمت کا کوئی اثر نہیں ہے۔ ہمارے افعال جہاں باتوں کو دکھلاتے  
 ہوں تو پھر ہم یہ کہیں کہ ہمارا کسی کے ساتھ منسوب ہونا سبق ہمارے لئے  
 نجات کا یہ روانہ ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ پانی کے نام سے پیاس نہیں بجھتی۔ خدا کے



خیال سے بھوک نہیں دودھ ہوتی۔ لباس کا تصور جسم نہیں تھا نکتا۔ اگرچہ چیز  
 میں حقیقت کا ہونا ضروری ہے تو جو چیزیں آپنے معیار نجات قرار دے لی ہیں  
 اُن کا نام نہ بخشوا سیکا۔ اُن کی حقیقت بخشوا سکی۔ الفاظ پر اثر نہیں مرتب ہوتا  
 اگر نام ہے اور اُس کے ساتھ پھر احترام نہیں ہے تو نام ہونا نہ ہونے سے بدرجہ  
 جیسا میں کہہ رہا تھا کہ جو لوگ دین ہیں۔ خدا کو نہیں مانتے وہ تو مانتے ہی  
 نہیں۔ مگر جو مانتے ہیں اور مانتے ہوئے اُس کا احترام نہیں کرتے تو اُن کا  
 طرز عمل بہت زیادہ قابل گرفت ہے۔ وہ عملی طور پر اُس کی عزت کمال  
 نہیں کرتے۔ یوں ہی جو لوگ رسول کی طرف اپنے کو منسوب ہی نہیں کرتے  
 وہ اتنا قابل الزم نہیں ہیں جتنا اتنی بڑی ہستی کی طرف منسوب ہونے کے بعد  
 مثال کے طور پر ایک کالج ہے جس میں بہت سے درجوں کے پڑھنے والے ہیں۔  
 نیچے درجے کا پڑھنے والا اگر کوئی غلطی کر دے تو اتنا قابل الزام نہیں ہے  
 جتنا بڑے درجے والا اسی سوال کو نہ حل کر سکے غلطی کرے تو قابل الزام  
 ہوگا۔ اس کا بڑا ہونا اس کو سبکدوش نہ کریگا بلکہ ذمہ داری میں اضافہ  
 کر دیگا۔ یونہی سمجھ لیجئے کہ خدا کی شریعت اور تعلیمات کا ایک حصہ ہے جس کے  
 پہلے معلم حضرت آدم تھے۔ اس کے بعد نصاب تعلیم بڑھتا گیا ابراہیم اور نوح  
 مبعوث ہوئے اور پھر حضرت موسیٰ کا درجہ آیا جتنے اس درجہ میں شریک ہوئے  
 والے تھے سب کو تعلیمات حاصل ہوئے۔ اس کے بعد آیا حضرت عیسیٰ



تعلیم کا درجہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو موسیٰ کو بھی مانتے ہیں اور اُس کے ماورائے موسیٰ  
 کی بھی تعلیم حاصل کر لے کے مدعی ہیں۔ نصاب تعلیم بڑھ گیا۔ اس لئے موسیٰ  
 کے ماننے والوں سے زیادہ عمل کی ذمہ داری اُن پر عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ  
 اُن کے پاس تو صرف موسیٰ کی تعلیمات پہنچیں عیسیٰ کے ماننے والے وہ  
 ہیں جن کے پاس اُن سے زیادہ تعلیمات پہنچیں اب جس وقت کہ عیسیٰ کے بعد  
 عالم انسانیت کا درجہ بلند ہوا اور وہ معلم انسانیت آیا جس کی تعلیم آخری  
 درجہ رکھتی ہے۔ اس درجہ میں جو آنے والے ہیں اُن کو کسی دنیا والے کے مذہب  
 پر اعتراض کی ضرورت نہیں مسلمانوں کو حق نہیں کہ موسائیوں عیسائیوں کے  
 افعال کی گرفت کریں لیکن اُن کے افعال رکے لئے گرفت کے قاب میں کیونکہ یہ  
 مدعی ہیں اس بات کے کہ اُس نبی کو مانتے ہیں جو سب بہتر تھا تو ان کو اپنی عمل سوا بت  
 کرنا چاہئے کہ اُس کی تعلیم سے انھوں نے کیا نتیجہ حاصل کیا۔ اس کے بعد رسول دنیا سے  
 اُٹھ گئے اختلافی مسائل بھی بیان کرنا نہیں ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ بعض لوگوں نے  
 عصمت کو وہیں تک ختم کر دیا اور خیال قائم کیا کہ رسول سب سے کوئی معصوم تعلیم دینے  
 والا نہیں ہے۔ تو اُن پر کتنی تعلیم پر عمل کرنے کی ذمہ داری ہر ضرائع اتنی ہی رسول کے  
 وحی کے ذریعہ سے پہنچی۔ اُس زمانہ میں جتنی تعلیم پہنچی ہے۔ بس اتنی تعلیم پر  
 عمل کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد کچھ لوگ دوسرے شخصوں  
 کہا کہ نہیں اب بھی ہمارے پاس معصوم ہستیاں موجود ہیں ہماری تعلیم کے لئے اور



وہ دین الہی کے حافظ ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اسے فرض نہیں کیا کہ  
نصاب تعلیم ختم ہو گیا بلکہ اس کے بعد بھی تعلیم جاری رہی۔ یہ درجہ آگے بڑھتا رہا  
کچھ لوگوں نے جیسے درجہ سے ساتھ چھوڑا کچھ نے ساتھ ساتھ آگے ساتھ  
چھوڑا لیکن اتنا مشتری جماعت وہ ہے جو پوری تعلیم کو حاصل کر رہی ہو  
اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اس سے تمام دنیا کے لئے نمونہ قائم کیجئے۔ آپ کو دکھانا  
ہا ہے کہ سب زیادہ ہمارے افعال قابلِ تائید ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو کسی بڑا اعتراض کا حق نہیں  
مگر دنیا کو ہمارے افعال کی جامع کا حق یہی معنی تھے اس کے کہ کو نوا لٹا نہ پینا  
دکان کو نوا علینا شینا دم ہمارے لئے رونق کا سبب تھا کہ دنیا تمہاری افعال  
کو دیکھ کر کہے کہ یہ ہمارے شیوہ میں ہمارے لئے دامن کا جیانہ بنا کہ تمہارے افعال  
ہم پر انگشت ثنائی کی جائے ہم اس میں ہیں ہم انہی سے درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں کہ ہم  
ان تمام علوم کو بھلا دیا جو ہم کو پڑھائے گئے تھے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تعلیم  
ہم سے ناراض ہونگے ہم کو اس شہ اور اس نسبت کے کہ ہم ان کے درجہ کے تعلیم یافتہ  
ہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ نقصان کا باعث ہوگا۔ ہم کو بیشک انتہائی شرف حاصل ہے  
مگر اس میں کام کا ہم کاظم بھی کریں وہ اس درجہ کی لاج بھی رکھیں جو ایک دوسری حیثیت یہ  
ملاحظہ کیجئے کہ آپ کو اپنی عمل کی سب سے زیادہ نگرانی کی ضرورت ہے۔ یہ امتحان میں لگراں کس غرض سے ہوتے  
ہیں اس لئے کہ لڑکے آپس میں کلیاں نقل نہ کریں اگر یہ لگراں لکھ جائیں درجہ سے  
تو ہنگامہ بڑا ہو جائے کوئی نظام ہی نہ قائم رہے۔ دنیا والے جو قائل ہیں کہ



اس وقت کوئی نگران ہی نہیں ہے، وہ اگر مطلق العنان ہوں تو ہوں مگر جب تک  
 عقیدہ ہے کہ ہمارا ایک نگران موجود ہے پردہ غیبت میں تو ہم کو بہت یاد دہانیوں  
 کے آراستہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم کو دوسروں سے کیا مطلب ہم کو تو اپنی افعال کو  
 بنانا چاہئے دیکھنا چاہئے کہ ہم کو کیا ہونا چاہئے اور ہمارے افعال و اعمال کیسے ہونا  
 چاہئیں۔ ہمارے ائمہ نے خود یہ اعلان کر دیا ہے کہ من اطاع اللہ فہو لنا محب  
 ومن عصی اللہ فہو لنا عدو۔ جو خدا کی اطاعت کرے وہ ہمارا دوست  
 ہے اور جو خدا کی نافرمانی کرے وہ ہمارا دشمن ہے۔ اس وقت بھی آپ کو تعلیم  
 دی گئی ہے کہا گیا ہے کہ ہر شے تمہارا نامہ اعمال تمہارے امام کے سامنے پیش  
 ہوتا ہے۔ اگر امام اچھا عمل دیکھتے ہیں تو چہرہ پر خالی آجاتی ہے اور اگر برا عمل  
 دیکھتے ہیں تو آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ لہذا ہم کو اپنے افعال و اعمال کی اصلاح  
 لازم ہے اس صورت میں یہ صحیح ہوگا کہ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ رسول کو مانتے  
 ہیں اور ائمہ کو مانتے ہیں۔ لیکن اگر اس میں ہم نے کوتاہی کی اور کوئی قصہ  
 نہیں کی اور ہم نے اس کی بالکل اہمیت کا احساس نہ کیا تو میں سوچ کتنا  
 ہوں کہ چاہی ہم بان سے سب کو ماننے کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا  
 عمل بتلائیگا کہ دل سے ہم کسی کو بھی نہیں مانتے۔

ALFRED HONG ESTD 1911

(Oriental Series)

URDU PRINTER

111